زیتون بانو

برنگِ آنسو

دھول

(ناول)

زیتون بانو

پشاور : ۱۸ ر جون ۱۹۳۸ء

ایم اے ، سی ٹی ، بی ایڈ

(تدریس)

تصانیف

پشتو	ہندارہ	——	افسانے
	مات بنگړي	——	"
	ژوندي غمونه	——	"
	ګجاوه	——	"
اردو	شیشم کا پتا	——	"
	وقت کی دہلیز پہ	——	"
	برگِ آرزو	——	ناول
	مہتابہ	——	"

انتخاب

خوشحال شناسی	——	فن اور شخصیت
دھنک رنگ	——	خواتین کے افسانے
جریدہ	——	راجندر سنگھ بیدی نمبر
دھڑکنیں	——	علاقائی افسانے

زیتون بانو

سنگِ میل پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور

ضابطہ

بار اوّل ـــــ ۱۹۸۴ء
تعداد ـــــ ایک ہزار
پبلشر ـــــ نیاز احمد
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
پرنٹر ـــــ منظور پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت ـــــ -/۳۰ روپے

تاج سعیدؒ

کے نام

اور ڈھول ....

زیبو

پہلے لگا، بانو نے زیبو کے پیکر میں ہماری آنکھوں میں ڈھول جھونک دی ہے۔

وہ وہی ہے۔ زیب النسأ —— مخفیؔ —— ایک بادشاہ کی شاعر بیٹی، جبر زدہ ہونٹوں، جبر زدہ آنکھوں والی لڑکی سرخ پوشے کہ لبِ بام نظر می آید۔ (اس کے اپنے لفظوں میں ...)

نہیں زیتون بانو نے ہماری آنکھوں میں ڈھول نہیں جھونکی۔ اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ڈھول جھونکنے کے لئے دوسرے فرد کے پاس آنکھیں ہونی چاہئیں لیکن پانچہزار سال کی معاشرتی ترقی کے بعد، مرد ذات (بلکہ بدذات) کے پاس آنکھیں ...... نہیں ہیں۔

پھر خیال آیا۔ ڈھول تو اب زیبو خود ہے جب وہ مہتابہ تھی تو چلپچی بن کر، مرد کے میل کو اپنے پانیوں میں حل کرلیتی تھی —— اس کی ڈھول کو برتن کی تہ تک اپنے اندر اتار لیتی تھی —— مرد اپنے ہی ہاتھوں کے ٹھہرے گدلے پانی کا اشارہ نہیں سمجھا تھا اور اس میں ڈوب مرنے کی بجائے چلپچی کو ٹھوکر مار کر آگے (!) بڑھ گیا تھا۔

زیبو جانتی ہے کہ مرد اب بھی آگے ہے اور اپنے پیچھے ڈھول اڑاتا اور آگے، اور آگے بڑھتا چلا جارہا ہے۔

چلئے ، بادشاہ کی بیٹی نہ سہی ، پہاڑوں کی بیٹی سہی ——
قیمت تو اسے بہرحال ادا کرنی ہے جو اس کی جیب میں
پیدائش کے وقت سے رکھ دی گئی تھی لیکن وہ کفر
پر آمادہ ہے - وہ خدا کی منکر نہیں - اس نے صرف
روائیتوں کا زہر پینے سے انکار کیا ہے اور حد ہے ایک
پٹھان لڑکی کی جیب میں سے اُسکی پہچان کے کاغذات
کے علاوہ ، غصہ بھی برآمد ہوا ہے - اور یہ برآمدگی جیسے
ناجائز مال کی برآمدگی ہو ۔۔۔۔۔۔

غیرت ایک اضافی قدر ہے —— ایک فالتو سکہ
جسے زیبو کی جیب میں سے گر جانا چاہیئے - زیتون بانو
نے اپنے ناول میں یہ تجویز پیش نہیں کی نہ اُس نے یہ
کہا ہے کہ غیرت ، قبیلے کی آنکھ پر چڑھی ہوئی چربی ہوتی
ہے لیکن زیبو کی صورت میں اِس نے قبائلی زندگی کے تشخص
کو سامنے رکھتے ہوئے ہولے سے اتنا ضرور کہا ہے - کہ
رات ، بس رات جتنی ہی ہوتی ہے اِس سے بڑی نہیں
ہو سکتی ——

" ڈھول " واقعات کا نہیں ، واردات کا ناول ہے
اس میں ' کہانی ' تو ہے ہی لیکن اِس کے ساتھ ساتھ
حقیقی زندگی کی تصویریں بھی ہیں - اِن تصویروں میں
فوٹو جیسی ہو بہو نقالی نہیں ہے بلکہ ایسا ہے کہ اِن پر
حقیقت کا گمان گزرتا ہے اور اِس گمان کے کہیں بہت
نیچے یقین ایک روشن تارے کی طرح نہیں - بلکہ ایک
ٹیس کی طرح دِل کو کاٹتا ہوا گزر جاتا ہے - اِسی لئے

یہ قبائلی زندگی کے بارے میں وہ پراپیگنڈہ تحریر نہیں
ہے جیسی تحریر حکومتوں کو "اٹک کے اس پار" کے
حوالے سے اکثر درکار ہوتی ہے ۔ اِس کے برعکس یہ
آزادی کے نغمے جیسی ایک تحریر ہے ۔ اور آزادی کا
یہ نغمہ پہاڑی سے گرنے والی آبشار کی طرح کبھی کبھی سیدھا
دِل پر گِرتا ہے ۔ یہ پشتون روایات اَور معاشرے کی
ایک ایسی کہانی ہے جس میں روایات کو چیلنج کرتے
ہوتے ، زیبو نے اپنا دل کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا
ہے اَور حیرت ہے ، وہاں ، درد کا نام دیوانگی ہے ....
قدیم اَور جدید ، شہر اَور گاؤں اِس ناول میں بظاہر
متصادم نظر آتے ہیں لیکن شاید زیتون بانو کے نزدیک
یہ ایک ہی صداقت کے دو پہلو ہیں —— زندگی دونوں
پہلوؤں سے عبارت ہونے کے بعد بھی ایک رہتی ہے ۔
اِس کے ساتھ ہی ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم جو کچھ ہوتے
ہیں ، جبلی طور پر نہیں ہوتے ، ہمارے گردونواح ہماری
تراش خراش کرتے رہتے ہیں اسی لئے زندگی ایک
ہونے کے باوجود —— دو راستے رکھتی ہے ۔ نیکی
اَور بدی کے راستے ...... خیال آتا ہے کہ اتنی سادہ
سی حقیقت بیان کرنے کے لئے اتنی بڑی واردات
سے گذرنا کیا ضروری تھا ۔ لیکن یہ سادہ سی حقیقت اپنے
اندر ایک مسلسل جدوجہد اَور اِس کے ساتھ انسانی نجات
کا خواب بھی رکھتی ہے —— زیبو اپنی ٹوٹ پھوٹ
کے باوجود ہماری انگلی پکڑ کر چل رہی ہے اَور اسے
اِس بات پر اصرار ہے کہ عورت کی نجات کا سوال

پورے بنی نوع انسان کی نجات کا سوال ہے شعور کی یہ وہ سطح ہے جہاں زیتون بانو چپکے سے ہمارے دل میں ایک فیصلہ رکھ دیتی ہے —— چھوٹے سے معاشرے کا ایک بڑا فیصلہ —— آزادی کا فیصلہ اور یہ فیصلہ کرنے پر ہم مجبور ہیں ....

پہاڑوں کی بیٹی ، زیب النساء —— آج مخفی رہنے سے انکار کرتی ہے ......

آیئے ، اِس نفی میں ، اِس کا اثبات بن جائیں۔
ورنہ دھول اُڑ کر ہماری آنکھوں ......

آنکھیں جو نہیں ہیں۔

پشاور، ۱۲ ستمبر ۸۴ء

—— احمد سلیم

دھول
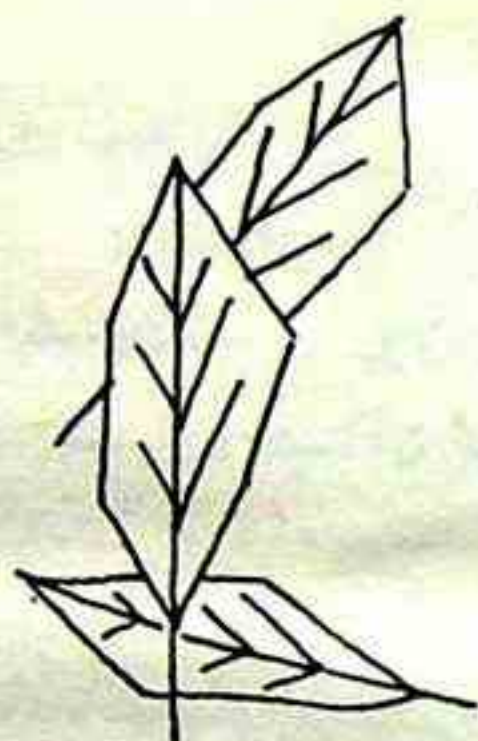
چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا
(مصحفی)

"کوئی بات نہیں بیٹے! تیرا پھوپھا ہے اگر زیادتی کر بھی لی تو درگزر کر۔" ماں نے بیٹے کو تسلی دیتے ہوئے کہا

"نہیں ماں شفیق بندے نے کبھی اپنے ماں باپ کی بھی پروا کی ہو۔ تو بات تھی، پھوپھا کون ہوتا ہے، جو بھرے حجرے میں مجھے یوں گھور کر دیکھے۔ ڈھیلے نہ کھینچ نکالوں پر.........." شفیق جو بڑی دیر سے منہ سے جھاگ نکال رہا تھا، غصّے سے غراتا ہوا بولا۔

"ہاں ہاں بیٹے یہی تو بات ہے کہ وہ زیبو کا باپ ہے اور زیبو ابھی باپ کے گھر بیٹھی ہے۔ بیٹی کا باپ اسی طرح کیا کرتا ہے جب بیاہ کر اس گھر آجائے گی، تو اگلے پچھلے تمام بدلے چکا دوں گی۔ میرا نام بھی گل شافیہ ہے۔"

"میں تو کہوں ماں گولی مار دو ایسے لوگوں کو۔"

"دیکھو بیٹے وہ ٹھہری ماں باپ کی اکلوتی اولاد، اس کے اس گھر آنے سے عنایت کی تمام جائداد کے سمجھو تم ہی مالک ہوتے۔" ماں اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولی۔

"اب اٹھو بھی کھانے دانے کا کچھ بندوبست کر لو، حجرے میں چھ سات دوست بھی میرے ساتھ بیٹھے ہیں، میں چلا حجرے تم کھانا بھجوا دو۔"

گل آباد کے ایک درمیانے درجے کے اس گھرانے میں ابھی ابھی جو کچھ ہوا، وہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ زیبو شفیق کی ٹھیکرے کی مانگ تھی، گاؤں کے اس گھر کے باہر حجرے میں شفیق اپنے چند دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں مشغول تھا۔ زیبو کا باپ عنایت اپنے چچازاد کریم خان کے گھر بڑے دلوں بعد کسی خاص کام سے آرہا تھا کہ حجرے میں شفیق کو گاؤں کے چند ناپسندیدہ اوباش قسم کے لڑکوں کے جھرمٹ میں بیٹھے دیکھا۔ عنایت کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے خشمگیں آنکھوں سے شفیق کو گھورا۔ شفیق کو یہ حرکت ناگوار گزری اور عنایت کے جانے کے بعد گھر آ کر ماں پر تمام غبار اتارا۔ ماں کے لئے شفیق کی اس قسم کی جیخم دھاڑ کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن زیبو کے باپ کے لئے یہ ایک نیا تازیانہ تھا۔

عنایت اللہ خان اسی گاؤں کا ایک متمول زمیندار تھا۔ باپ نے خاصی جائیداد چھوڑی تھی، عنایت اللہ خان نے اس میں کوئی بھی اضافہ نہ کیا تھا، وہ عجیب طبیعت اور منطق کا آدمی تھا۔ اس کو جمع کرنے سے زیادہ کمانے سے دلچسپی تھی گو اس کی اپنی نرینہ اولاد نہ تھی لیکن وہ گاؤں کے چند ذہین لڑکوں کا کفیل تھا جو اسی کی مدد سے پڑھ لکھ کر آج برسر روزگار تھے۔ گاؤں کا اسکول اسی کے طفیل چل رہا تھا۔ شروع شروع میں اس نے کافی کوشش کیں کہ گل آباد کی بچیاں بھی پڑھ لکھ سکیں۔ ان کے لئے اپنی بیٹی زیبو کی کاوشوں سے گھر پر پڑھانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ لیکن انہیں سال ڈیڑھ ہی میں اندازہ ہو گیا کہ ابھی یہاں گھروں کے اندر علم کا چراغ جلانا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے باپ بیٹی نے باقاعدہ طور پر لڑکیوں کا کوئی الگ اسکول کھولنے کا ارادہ تو ترک کر دیا لیکن گاہے گاہے جو بچیاں یونہی ازراہِ شوق پڑھنے آجاتی تھیں، زیبو اُن کو مقدور بھر پڑھاتی، لیکن یہ سلسلہ جلد ہی منقطع ہو جایا کرتا کہ گاؤں کی بچیوں کو ہزاروں اور کام بھی نبٹانے پڑتے ہیں، جن میں درجنوں بہن بھائیوں کو کولہے پر اٹھائے رکھنا اور پھرانا خاص کام ہوتا ہے، بلکہ ہر بڑی بہن کا یہ ایک طرح کا فرض ہوتا ہے کہ چھوٹے بہن بھائیوں

کی نگہداشت اور پرداخت کرے۔ کیونکہ ماں حاملہ ہوتی ہے یا پھر زچگی میں ہوتی ہے۔ اور پھر لڑکیاں گھرداری میں ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

گاؤں کی ایسی ہی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی افروزہ بھی تھی۔ جس کا اپنا باپ مر چکا تھا۔ اس کا چچا اس کی ماں کو ملکیت سمجھ کر نکاح میں لے آیا تھا۔ پھر بات بات پر اسے بدقسمی کھوسٹ ہونے کے طعنے ملنے لگے اور ساتھ ہی ہر سال ڈیڑھ سال بعد ایک بٹیا یا بیٹی اس کی گود میں بھرتا گیا جن کو افروزہ پالتی گئی۔ دنیا جہاں کا نکھٹو سکندر، ماں بیٹی نے عنایت خان کے گھر زیبو کے زیر سایہ کچھ کمانا شروع کر دیا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ افروزہ باقاعدہ طور پر زیبو کی خاص ملازمہ قرار پائی اور اس کے بدلے میں عنایت خان نے ان کے گھر ایک معقول رقم ہر ماہ تنخواہ کے بہانے بھجوانا شروع کر دی تھی۔

افروزہ زیبو کے کئی ذاتی کام سرانجام دیتی تھی۔ اس کے کپڑے دھونا استری کرنا، جب زیبو کی طبیعت خراب ہوتی تو اس کو دوا وغیرہ پلانا بھی اس کے کاموں میں شامل تھا۔ اور پھر ایک خاص کام جو افروزہ کے سپرد تھا وہ زیبو کے فارم میں کام کرنا تھا۔ زیبو کے اس فارم کو ایک قسم کا پولی فارم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ اس فارم میں مرغیاں بھی پالی جاتی تھیں، چند بھیڑ بکریاں بھی رکھی ہوئی تھیں اور شہد کی مکھیوں کے ڈبے بھی رکھے ہوئے تھے۔

اس کہانی کے جس پہلو سے ہم نے بات شروع کی تھی اسی سلسلے کی کڑی کو ہم عنایت خان کے اپنے گھر میں داخل ہونے سے جوڑ رہے ہیں۔

عنایت اللہ خان عجیب فطرت کا آدمی ہونے کے باوصف ایک مرد بھی تھا اور پھر سب سے بڑھ کر ایک باپ جو اپنی اکلوتی اولاد زیبو سے بے پناہ پیار کرتا تھا، جس کے لئے زیبو کی خواہش کا احترام ماننا کا ایک لازمی جزو قرار پا چکا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ زیبو کے مستقبل سے خائف بھی رہتا تھا۔ جس کا اظہار وہ کئی بار اپنی بیوی مہر النساء پر بھی کر چکا تھا۔

جس وقت عنایت خان گھر میں داخل ہوا، تو وہ کافی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ حسب عادت عصا اس کے ہاتھ میں تھا، سفید کھدر کے صاف ستھرے لباس میں ملبوس، کھدر ہی کی بڑی چادر لپیٹے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باورچی خانہ تک آیا تو افروزہ پر نظر پڑی۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی پیاز چھیل رہی تھی۔ عنایت اللہ خان نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن افروزہ کے علاوہ کوئی اور نظر نہ آیا۔ وہ صحن میں پڑی ہوئی چارپائیوں میں سے ایک چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اور افروزہ کو مخاطب کیا۔

"افروزہ! بی بی کہاں ہے؟" افروزہ جلدی سے باہر نکل آئی اور پوچھا۔ "خان بابا بڑی بی بی کو پوچھ رہے ہیں یا زیبو بی بی کو؟"

"بڑی بی بی کو پوچھ رہا ہوں" عنایت خان نے ماتھے پر بل ڈالے ہوئے تھے، جسے افروزہ نہیں دیکھ سکی تھی۔

"جی وہ تو زیبو بی بی کے فارم کی طرف گئی ہیں۔ وہ چتیری مرغی کے نیچے رکھے انڈوں سے چوزے نکل آئے ہیں، ان کو دیکھنے گئی تھی۔" افروزہ نے بڑی دلچسپی سے مسکرا مسکرا کر عنایت خان کو مطلع کیا۔ عنایت خان کی تیوری کے بل اور گہرے ہو گئے۔

"کیا بچگانہ حرکت ہے۔ یہ چتیری، کالی، نیلی، پیلی مرغیوں کے نیچے رکھے انڈوں سے چوزے تو اس گھر میں روز نکلتے رہتے ہیں۔ یہ اس گھر میں رونما ہونے والا کوئی نیا واقعہ ہے؟ بڑی بی بی کا خود جا کر چوزے دیکھنا اس میں کیا تک ہے؟ سمجھ میں نہیں آیا۔

افروزہ نے بھانپ لیا کہ جس خبر سے خان بابا اتنے خوش ہوا کرتے تھے آج اس میں مین میخ نکال رہے ہیں، ضرور کوئی اور بات ہے۔ چنانچہ جلدی سے بولی۔

"جی بلا لاؤں خود جا کر؟"

"نہیں رہنے دو، چوزوں سے دل بہلاتی رہے، جب جی بھر جائے گا، خود ہی اِس طرف آجائے گی۔" عنایت خان نے اسی لہجے میں بات کی، اور اپنا سر عصا پر ٹکا کر سوچوں میں گم ہونے کو تھا کہ افروزہ زور سے بولی۔

"خان بابا! بڑی بی بی خود ہی فارم سے نکل کر اس طرف آرہی ہیں۔" عنایت خان نے عصا سے سر اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا، وہ دیوار کے ساتھ لگی گھڑونچی کی طرف مڑ گئی۔ وہاں پڑے پانی سے بھرے ہوئے ایلومینیم کے صاف ستھرے لوٹے سے ہاتھ دھونے لگی۔ پھر غسل خانے کے باہر نکلی ہوئی برجھتی کے نیچے ہینگر میں لٹکے ہوئے کھدر کے تولیے سے ہاتھ پونچھے اور شوہر کی طرف چل پڑی، ابھی چند قدم ہی اٹھاتے ہوں گے کہ عنایت خان کے طنزیہ جملے سے ٹھٹھک گئی۔

"کوئی بات نہیں ہے اگر ابھی چوزے دیکھنے سے جی نہیں بھرا ہے تو میں بیٹھا ہوا ہوں، مزید انتظار بھی کر سکتا ہوں، بلکہ ہفتوں مہینوں بیٹھ سکتا ہوں۔ جب تک چوزے بڑے نہ ہو جائیں اور انڈے دینے شروع نہ کر دیں۔"

"بات کیا ہے؟" جو اتنی کڑوی کسیلی سنانے لگے ہو۔ تم نہیں جانتے زیبو کا پاگل پن۔ چوزے کیا نکل آئے کہ جیسے پچیس ہزار کا بانڈ نکل آیا ہو، وہ اچھلتی کودتی مجھے دکھانے کو کھینچ لے گئی۔ نہ جاتی تو دگبر ہو جاتی اب کیا بھی کیا جائے۔" یہ کہتے کہتے ساتھ کی دوسری چارپائی پہ آکر بیٹھ گئی اور افروزہ سے کہا بیٹی چائے تو بنا کر لا۔

بی بی جی میں نے تو خان بابا کے گھر میں داخل ہوتے پانی چولہے پر دھر دیا تھا۔ بس چند منٹوں میں تیار ہوا چاہتی ہے۔"

مہر النساء نے بڑے غور سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ عنایت خان

بیوی کی بات کے درمیان ہی اپنا سر عصا پر پھر رکھ چکا تھا۔ مہرالنساء نے اٹھ کر عصا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

" لاؤ یہ مجھے دو، اور تم پاؤں اٹھا کر ٹھیک سے چارپائی پر ٹک کر بیٹھ جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے مہرالنساء نے عصا چارپائی کے بان میں اٹکا کر کھڑا کیا پھر تکیہ ٹھیک کر کے رکھا تاکہ عنایت خاں اس پر ٹیک لگا کر آرام کرے۔ کیونکہ اس کے تیور تبلا رہے تھے کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن عنایت خاں جوں کا توں بیٹھا رہا۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ عصا کے ہٹائے جانے سے اب اس نے دونوں ہاتھ رانوں پر ٹکا کر ان پر ٹھوڑی رکھ لی۔ اس نے دونوں پیر زمین پر اس طرح دبا کر رکھے ہوئے تھے جیسے زمین کے ساتھ چپک کر اپنا توازن قائم رکھنا چاہتا ہو کہ زمین گھومتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بھینچ رکھی تھیں اور کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ مہرالنساء سے نہ رہا گیا۔

" زیبو کے ابا بات کیا ہے؟ تم تو کریم خان بھائی کے ہاں جانے کا کہہ گئے تھے۔"

"ہاں گیا تو تھا۔" عنایت کا مختصر جواب تھا۔

"پھر؟" مہرالنساء کے پورے وجود نے سوال بن کر پوچھا۔

" پھر یہ کہ۔ یہ کہ ...." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور مشکل سے تھوک نگلتے ہوئے اٹھنے لگا لیکن مہرالنساء نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔

" بتا بھی چکو، کیا باتیں ہوئیں جا کر، خدانخواستہ کچھ ......"

" خدانخواستہ کیوں۔ خواہ مخواہ نہ کہو" عنایت نے واپس بیٹھتے ہوئے طنزاً کہا۔

" دیکھو زیبو کے ابا ہماری شادی کو کتنے برس گزر چکے ہیں نہ تم نے کوئی بات چھپائی مجھ سے اور نہ مجھے کبھی ایسا موقع دیا کہ تم سے کچھ

چھپاتی۔ ہماری تمام عمر ایک دوسرے کی سنتے اور ایک دوسرے کو بتاتے گزری ہے۔ خدا کے لئے پہیلیاں مت بجھواؤ۔ بتاؤ کیا ہوا کریم خان بھائی کے ہاں جاکر؟" مہرالنساء نے بالکل سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ کیونکہ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی اور وہ عنایت خان کی جیون ساتھی بنی اس گھر میں آئی تھی تب سے آج تک ان دونوں کی ازدواجی زندگی میں تو تکار یا عامیانہ قسم کے جذبات نام کی کوئی چیز داخل نہ ہوئی تھی۔ وہ دونوں بلکہ ان کی بیٹی تک بہت کم کسی بات یا واقع سے مشتعل ہوتے تھے۔ جبھی تو یہ ایک مثالی خاندان مانا جاتا تھا، جو ہر قسم کی ریاکاری اور دوغلے پن سے عاری تھا۔ اس مختصر ترین خاندان کے پاس دنیا کی ہر چیز موجود تھی لیکن اگر کوئی کمی تھی تو وہ اولاد کی تھی۔

زیبو ان کی تیسری اولاد تھی۔ زیبو سے پہلے دو بھائی ہوئے تھے جو بچپن ہی میں مر چکے تھے زیبو کے بعد دو اور بھائی اور ایک بہن پیدائش کے کچھ عرصہ بعد خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔

عنایت اللہ خان اور مہرالنساء تایا چچا کی اولاد تھے۔ ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا، کہ ان کی نرینہ اولاد مشکل سے زندہ رہ سکے گی۔ اس لئے کہ (INTERMASSAGES) کی وجہ سے ان کی جینیز کمزور پڑ چکے ہیں اور یہ نسل آگے نہیں بڑھ سکے گی، اور چھ بچوں میں سے صرف زیبو اب تک حیات تھی۔

عنایت اللہ خان نے اپنی خاندانی روایات کو پس پشت ڈال کر زیبو کو میٹرک کروا لیا تھا۔ وہ اسے آگے بھی پڑھانا چاہتا تھا لیکن مہرالنساء نے آگے پڑھنے نہ دیا۔ کیونکہ زیبو کا بچپن کا منگیتر شفیق ناراض ہوتا تھا ورنہ اب تک زیبو بہت آگے نکل چکی ہوتی، وہ ایک ذہین اور محنتی بچی ثابت ہوئی تھی۔

عنایت اللہ خان اپنی بیٹی کو اکثر خیالوں میں لیڈی ڈاکٹر بنے دیکھا کرتا تھا، جو اس کے پروگرام کے مطابق اپنے گاؤں اور ارد گرد کے دوسرے دیہات

کی واحد لیڈی ڈاکٹر ہوتی اور ہوتی بھی ایک لاثانی ڈاکٹر، عنایت کو اللہ نے ضرورت سے کہیں زیادہ دے رکھا تھا۔ اسے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اس کے مستقبل کئی ایک پروگراموں میں سے ایک پروگرام یہ بھی تھا کہ وہ خیراتی شفاخانہ کھولے گا۔ حکومت کی امداد کے بغیر وہ اسے چلائے گا اور زہرہ اس کی ڈاکٹرنی ہو گی لیکن شفیق کی بے جا ضد اور ہٹ نے عنایت کے اس پروگرام پہ پانی پھیر دیا تھا۔

وہ یہ بھی چاہ رہا تھا کہ شفیق بھی پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنے کہ دیہی علاقوں کو طبی سہولتیں میسر نہیں ہیں، لیکن وہ نیک بخت میٹرک تھرڈ ڈویژن میں پاس کر کے ایف اے میں ایسا پھنسا کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اگر بھی پاس کیا تو کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کر کے گیا۔ اور وہ اب تیسری بار بھی ایف اے میں رہ گیا تھا۔

عنایت اللہ خان کو جب اخبار سے شفیق کے سہ بارہ فیل ہونے کا پتہ چلا تو وہ بیوی کو اور کچھ بتائے بغیر صرف یہ کہہ کر کریم خان کے گھر کو چلا تھا کہ اُس سے ایک ضروری کام ہے اور غالباً یہ زندگی میں پہلی بار ہوا ہو گا۔ کہ عنایت نے بیوی سے اصل مدعا چھپائے رکھا اور اب وہ گھر میں بیوی کے سامنے بیٹھے ہوئے اِس رو داد کے سنانے میں پس و پیش کر رہا تھا جو وہاں کریم خان کے گھر رونما ہوئی تھی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد عنایت کو آخر بتاتے ہی بنی:

"کل شام اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایف اے کے ریزلٹ پر نظر پڑی شفیق کا خیال آیا، اِسی غرض سے وہاں گیا تھا کہ مزید معلومات حاصل کر سکوں۔"

"ہاں سچ شفیق نے اس بار بارھویں کا امتحان دیا تو تھا، پھر کیا ہوا؟" مہرالنساء نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔ لیکن اس خدشے کے تحت کہ مبادا وہ پھر فیل ہوا ہو۔

"ہونا کیا تھا، وہی ہوا جو ظاہر تھا۔"

عنایت خان کے لہجے میں مہرالنساء کو پہلی بار ایک تلخی کی چبھن کا احساس ہوا۔ جسے اس نے برا محسوس کیا۔

"کوئی بات نہیں، مرد ذات ہے۔ کبھی نہ کبھی تو پاس کر ہی لے گا۔"

"تیسری بار بھی پاس نہیں کر سکا، تو کیا تیا مرت تک امتحان ہی دیتا رہے گا اور ......"

عنایت کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا جا رہا تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ دیر پہلے شفیق کے باپ کریم خان کے ساتھ باتوں کی بدمزگی کی کڑواہٹ ابھی تک عنایت خان جیسے سرد مزاج آدمی کے منہ کو کڑوا کئے ہوئے ہے۔ مہرالنساء نے سب کچھ محسوس کر لیا تھا اور اسی لئے وہ اپنے طور پر فضا کو مزید مکدر بنانے سے روک رہی تھی، چنانچہ اس نے دبے الفاظ میں کہا۔

"تو تم کو کیا پڑی تھی جو خوامخواہ چلے گئے، یا تو یہ ضد چھوڑ دو کہ جب تک شفیق چودہ جماعتیں پاس نہیں کرے گا۔ زیبو کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ دو گے اور یا پھر جانے دو جب تک خدا کی مرضی ہو، زیبو ہمارے پاس بیٹھی ہے ہمیں کیا اتنی جلدی پڑی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن دیکھو نا۔ آخر کو زیبو کے مستقبل کا ساتھی ہے کبھی نہ کبھی تو زیبو کو اس گھر جانا ہے۔ بتاؤ نہ پھر ایسے لڑکے کے ساتھ وہ خوش رہ سکے گی۔ جسے نہ بڑوں کا لحاظ پاس، نہ اپنی پوزیشن کا خیال نہ ......؟"

عنایت نے بڑی لاچارگی کے انداز میں اپنے دونوں ہونٹ پھیلا کر سر کو ادھر ادھر کچھ اس طرح سے جھٹکے دیتے جیسے کسی انجانے بوجھ

نکلے کسمسا رہا ہو۔ اور اپنا سر بوجھ سے چھڑانا چاہتا ہو۔
لیکن اُس کی گردن جس رسی سے بندھی تھی وہ روایت کا طوق
تھا۔ اپنے خسر اور تایا کے غلط فیصلے کی بیڑیاں تھیں جن میں وہ دونوں
پیروں سے بندھا ہوا پشیمانی کے گندے تالاب میں غوطے کھا رہا تھا۔ وہ
نکلنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے خسر خان محبت
خان کا کیا دھرا تھا۔
ابھی زیبو کی پیدائش میں چند ماہ باقی تھے، جب محبت
خان کو عنایت کے باپ بننے کا پتہ چلا تو انہوں نے اعلان کیا اگر بیٹا ہوا
تو اس کے لیے کریم خان کی چھ سالہ بیٹی شمو کا رشتہ طے ہوا اور اگر بیٹی
ہوئی تو وہ کریم خان ہی کے بیٹے شفیق کی منگیتر ہو گی۔ اور اسی سے بیاہی
جائے گی۔
اور زیبو نے جب اس دنیا میں ابھی پوری طرح ـــــ
آنکھ کھول بھی نہ تھی کہ ماموں کے بیٹے آٹھ سالہ شفیق کے ساتھ بڑی دھوم
دھام سے اس کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔
زیبو کے ابتک زندہ بچ رہنے میں شفیق کی قسمت کے ستارے
کی چمک کئی آنکھوں کو نظر آچکی تھی۔ بلکہ زیبو کی ماں کی آنکھیں تو اس چمک سے
اتنی چندھیائی گئی تھیں کہ اس کو شفیق کی کوئی بھی ناپسندیدہ حرکت نظر آ ہی نہیں
سکتی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ اسی کے طفیل تھا کہ اس کی واحد اولاد زیبو زندہ بچی
رہی، ورنہ وہ بھی اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح بچپن ہی میں اللہ کو پیاری
ہو گئی ہوتی اور اب یہ جوڑا لاولد ہوتا اور اگر ایسا ہوتا تو شفیق کا باپ کریم خان
اور اس کی ماں گل شافیہ اور شفیق خود بغیر کسی واسطے کے عنایت خان کی پوری جائداد
کے بلا شرکت غیرے مالک بن بیٹھے ہوتے۔
عنایت خان تین دو بہنوں کا ایک بھائی تھا۔ بہنیں بیاہی

گئی تھیں۔ بڑی بہن اپنے پیچھے دو بچے چھوڑ گئی تھی۔ اس کے شوہر نے دوسری شادی رچالی تھی، دونوں بچے سوتیلی ماں کے قبضہ میں تھے اور اب ان کے لئے عنایت خان کا خاندان پرایا ہو چکا تھا۔ دوسری بہن شہر بانو کی شادی گل آباد سے تین چار گاؤں دور ایک اور گاؤں سر ہند میں ہوئی تھی۔ لیکن وہ ایک بیٹے کی ماں بن کر بیوہ ہوگئی تھی، عنایت خان اُسے گھر لانا چاہتا تھا پر اس کی سسرال نہ مانی تھی اور اب عنایت اس کو معقول امداد دے رہا تھا۔

بہن بیٹیوں کو کون جائدادوں میں حصہ دیتا ہے حبیب خان نے پوری جائداد اپنے اکلوتے بیٹے عنایت خان کے نام لکھدی تھی اس کا طریقہ تھا کہ جب کسی بیٹی کی شادی رچاتا پہلے اس سے سرکاری اسٹامپ پر بھائی کے حق میں انگوٹھا لگواتا اور اگر انگوٹھا نہ بھی لگواتا تو پشتون معاشرے میں کب کسی بہن بیٹی نے باپ کی جائداد میں حصہ مانگا ہوگا۔ لیکن وہ تھا بڑا قانونی آدمی ہر کام سوچ سمجھ کر کرتا اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتا کہ کوئی پشتون بھی اپنی جائداد کی ایک انچ زمین بھی دوسروں کی ملکیت میں دینا برداشت نہیں کر سکتا۔

شفیق کی منگنی بھی ایک خاص منصوبے کے تحت عنایت اللہ خان کی بیٹی زیب النساء سے کر دی گئی تھی تاکہ ایک بھائی کی جائداد دوسرے بھائی کے گھر جائے اور کریم خان کے بیٹے شفیق کو جو وراثت باپ سے ملنی تھی اس کی وارث عنایت کی بیٹی زیبو کی اولاد کہلائے۔

صحبت خان، جدیب خان اور رضا خان تین سگے بھائی تھے جو سمندر خان ملک کے بیٹے تھے۔ سمندر خان ملک کو کچھ جائداد ورثے میں باپ دادا سے ملی تھی اور ساتھ ہی گاؤں کی ملکی بھی جس کی بدولت وہ اِدھر اُدھر سے اور زمینیں مکانات خرید کر کافی جائداد کا مالک ہو گیا تھا۔
جب بھی گاؤں کے کسی آدمی کو روپے پیسے کی ضرورت پڑتی، کسی کی شادی بیاہ یا ختنے، عقیقے ہوتے اور انہیں پیسہ درکار ہوتا تو سمندر خان ملک ان کی مالی امداد کرتا۔ پھر ایک وقت آتا کہ قرض لینے والا روپے پیسے کی صورت میں یہ قرض واپس کرنے کے قابل نہ ہوتا تو اپنے کھیت اور مکان وغیرہ پہلے گروی رکھتا پھر سمندر خان ملک سے کچھ اور روپے لے کر انگوٹھا لگا لیتا۔ انگوٹھا لگانے والا مطمئن ہوتا کہ کھیت یا مکان کے بدلے میں ایک عورت یا بچوں کی خوشیاں ملیں اور ملک خوش ہوتا کہ جائداد میں اضافہ ہوا۔ سمندر خان صرف انہی لوگوں کی روپے پیسے سے مدد کرتا تھا جن کی اپنی کچھ زمین یا مکان ہوتا تھا۔ چنانچہ سمندر خان ملک کی زمین اور جائداد آہستہ آہستہ بڑھتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ گاؤں کی ملکی بھی ایک خاندانی ورثہ بن کر رہ گئی۔
جب سمندر خان ملک اِس دنیا سے سدھارے تو اُن کا بڑا بیٹا

صحبت خان از خود گاؤں کا مالک بن گیا۔ لیکن اب صحبت خان اور حبیب خان کی بیویاں اکٹھی رہ نہیں سکتی تھیں چنانچہ گھر علیحدہ ہوئے۔

رضا خان بھائیوں میں چھوٹا تھا اُس کی منگنی گاؤں کے ایک اور بااثر شخص محمد یوسف کی بیٹی رقیہ بی بی سے کردی گئی تھی۔ لیکن ہوا یوں کہ رضا خان مردان کے کسی متمول گھرانے کی بہو بھگا لے گیا اور محمد یوسف کی بیٹی رقیہ بن بیاہی باپ کے گھر بیٹھی رہ گئی۔ محمد یوسف کا اثر رسوخ گاؤں میں صرف اس حد تک تھا کہ وہ ایک پڑھا لکھا سمجھدار شخص تھا۔ لوگوں کے بھی لکھاتے اور نامے بھی بلاتے پڑھتا۔ خطوط اور درخواستیں لکھتا اور جب بھی گاؤں میں کوئی واردات سرزد ہوتی اور تھانے دار وغیرہ آتے تو معاملہ سلجھانے اور صلح صفائی کروانے کے لئے اس کی خدمات لی جاتی تھیں۔ محمد یوسف کسی بھی فریق کے حق میں یا خلاف کسی قسم کی گواہی وغیرہ دینے سے گریز کرتا۔ اکثر حالات میں کوئی نہ کوئی فریق اس سے ناراض بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن محمد یوسف کو معاملہ فہمی آتی تھی اس بنا پر وہ گاؤں میں اپنا وقار قائم رکھے رہا۔ کیونکہ کسی کے ذاتی معاملات سے زیادہ تعرض نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اور پھر جب سے ملکوں کے خاندان میں اس کی بیٹی کی منگنی ہوئی تھی اس کی عزت اور توقیر میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ محمد یوسف کے نزدیک یہ سب باتیں فرضی تھیں لیکن بہرحال اُسے اسی گاؤں میں رہنا تھا۔ یہیں اس کے مردے دفن تھے اور اسی گاؤں میں وہ پلا بڑھا تھا۔ اس لئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان مراعات کا مالک تھا۔ جو گاؤں والوں نے از خود اسے دی تھیں اور جن سے وہ جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اب چونکہ دونوں خاندان ایک طرح سے مل چکے تھے اس لئے بھی وہ سمندر خان ہی کے خاندان کا ایک فرد مانا جانے لگا تھا۔ لیکن چونکہ

وہ بیٹی کا باپ تھا، اور پشتون معاشرے میں یہ بات معیوب سمجھی جاتی ہے کہ بیٹی کا باپ لڑکے کے خاندان کے آگے پیچھے پھرے اس واسطے کئی مواقع پر اب وہ اپنے وہ فرائض جو گاؤں والوں نے خود بخود اس کے ذمے ڈال رکھے تھے ان کی بجا آوری سے تھوڑا بہت اجتناب کرنے لگا تھا اور جب بھی کوئی ایسی بات ہو جاتی یا حسب سابق اس کی ضرورت پڑتی تو وہ سمندر خان ملک کے بیٹوں کے مقابلے میں خود کو کمتر ثابت کرنے کی حتے الوسع کوشش کرتا کہ اب سمندر خان ملک کے بیٹوں میں سے رضا خان نے کافی پڑھ لیا تھا۔ حبیب خان بھی تھوڑا بہت پڑھ لکھ سکتا تھا۔ چنانچہ سمندر خان ملک کے حجرے میں محمد یوسف کا آنا جانا قدرے کم ہو گیا تھا۔

پھر جب رضا خان مردان کے کسی متمول خاندان کی بہو بھگا لے گیا اور اس کی بیٹی رقیہ کا سہاگ دوسری عورت نے لوٹ لیا۔ تو اس بات سے محمد یوسف بہت دل برداشتہ ہوا، وہ ایک پشتون باپ تھا اسے معلوم تھا کہ جب تک رضا خان اور اس کے خاندان والے خود اجازت نہیں دیں گے تو اس بیٹی کی بات اور کہیں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ چونکہ نکاح میں طلاق تو ہو سکتی لیکن منگنی توڑنا یا تڑوانا پشتون معاشرے میں اتنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایسا بندھن ہوتا ہے جس میں لڑکے اور لڑکی کے خاندان والوں کی عزت اور ناموس خود بخود بندھ جاتے ہیں لڑکے والے اگر چاہیں تو بوجوہ اس کو توڑ بھی سکتے ہیں لیکن لڑکی والوں کے لئے یہ ایک صبر آزما مرحلہ بن جاتا ہے۔

پھر رقیہ کے معاملے میں ہوا یوں کہ رضا خان نے کہلوا بھیجا رقیہ اس کی مانگ ہے اسے کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔"

محمد یوسف جیسا سمجھدار آدمی سمجھ گیا کہ اب اس کی جوان بیٹی رقیہ کی

زندگی کانٹوں پر بسر ہوگی۔ محمد یوسف کے سوائے ایک مکان اور چند کھیتوں کے اور کوئی خاص ذریعۂ آمدن بھی نہیں تھا۔ وہ ایک معمولی سرکاری ملازم تھا اور ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے ان کی بھی شادی بیاہ ہو جائے تو پھر کون ضمانت دے سکتا ہے کہ بن ماں کی بیٹی رقیہ کو بھائی بھاوجیں عزت سے رکھیں گی۔ غالباً انہی سوچوں نے محمد یوسف کو اندر ہی اندر گھلا ڈالا اور پنشن لئے بغیر ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

رقیہ بن ماں کے پلی لڑکی تھی اس نے جو کچھ پس انداز کیا تھا اس سے اپنے بڑے بھائی کی شادی کرا ڈالی اور گھر میں بھاوج کے چونچلے اٹھلانے لگی۔ رقیہ کی بھاوج سیفورہ بڑی سگھڑ اور سمجھ بوجھ والی عورت ثابت ہوئی، اس نے گھر کا تمام بندوبست اپنے شوہر سلیم جان اور نند رقیہ بی بی کے پاس جوں کا توں رہنے دیا اور گھر بار رقیہ اور سیفورہ مل کر چلاتی رہیں سلیم کی تنخواہ میں سے سیفورہ کے لیے جو جیب خرچ کاغذ میں لکھ کر دیا گیا تھا وہ ہر ماہ رقیہ نکال کر بھاوج کو دیتی رہی۔ شروع شروع میں اس نے لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن رقیہ نے اسے یہ کہہ کر چپ کرایا تھا۔

" لے لیا کرو، شادی شدہ عورتوں کی بیسیوں اور ضروریات ہوتی ہیں۔ کیا ہر وقت سلیم لالہ سے مانگا کرو گی۔ پیسہ ایسی چیز ہے کہ پاس ہو تو اپنا ہے ورنہ دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے "

اور سیفورہ جو کچھ اسے ہر ماہ ملتا رہا اس سے اپنی ضروریات اور اپنی نند کے لئے کچھ نہ کچھ خرید لیا کرتی تھی۔ لیکن اس نے کبھی بھی رقیہ پر یہ بات ظاہر نہ ہونے دی اس نے سمجھا تھا کہ ایک نہ ایک دن رضا خان کا دل بھگائی ہوئی عورت سے بھر جائے گا اور وہ رقیہ کو بیاہ کر لے جائیگا یا وہ عورت اسے مجبور کرے گی کہ وہ رقیہ کا خیال دل

سے نکال دے اور اسے چھوڑ دے۔ تاکہ اس کی شادی کہیں اور ہو جائے۔ بہرحال رتبہ اس عورت کی ایک طرح سے سوکن تھی اور اس نام نہاد سوکن سے پیچھا اسی طرح چھڑایا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ رضا خان اس مٹی کا بنا تھا جس میں کوئی لچک نہ تھی کچھ تو وہ خود اکڑ خان تھا اور کچھ اس کی بھگائی ہوئی وہ عورت ایسی عجیب فطرت کی مالک تھی کہ اپنی ہی جنس کو اذیتیں دے کر خوش ہوتی تھی۔ وہ جس شوہر کے پاس سے بھاگ کر آئی تھی اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے بہت چاہا تھا کہ وہ ساس نندوں سے الگ ہو جائے لیکن اس کا شوہر ایسا کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ اور یہ رضا خان کے ساتھ بھاگ آئی، اور اپنے پیچھے ایک معصوم بچی بھی چھوڑ آئی جسے بعد میں اس کی ساس اور نندیں پالتی رہیں۔ اس کی ساس تو یہ دکھ سہہ نہ سکی اور مر گئی لیکن اس کا شوہر اذیت کا یہ طوق گلے میں لٹکائے اپنی بیٹی بہنوں اور چھوٹے بھائی کے لئے زندہ رہا۔ تلاش بسیار کے بعد اُسے صرف اتنا پتہ چل سکا تھا کہ اس کی بیوی زبیدہ کو گل آباد کے ملک سمندر خان کے چھوٹے بیٹے رضا خان نے بھگایا تھا۔ زبیدہ کا شوہر عبیداللہ جان اگر چاہتا تو بیوی کی بازیابی کے لئے پولیس کی مدد لے سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہ کیا اور نہ ہی زبیدہ کو اس کی غیر موجودگی میں طلاق دی۔ وہ اب بھی اس کو اپنی منکوحہ بیوی سمجھتا تھا۔ حالانکہ بہنوں نے کئی بار بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ زبیدہ اپنی مرضی سے بھاگی ہے، رضا خان خودسر اور نافرمان لڑکا ہے ورنہ اس کا خاندان ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کر وہ زبیدہ کو باقاعدہ بیوی بنانے کے لئے عبیداللہ جان کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے قتل کرا دے۔

اور ہوا وہی جس کا خدشہ عبیداللہ جان کی بہنوں کو تھا۔

جس طرح زبیلو اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اسی طرح بے خبری میں وہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اور اب اس کی کنواری بہنیں یتیم بیٹی اور کمسن بھائی کلیم جان اپنے وارثوں کے رحم وکرم پر بے یار و مددگار رہ گئے۔ جانے ان بیچاروں کا مستقبل کن ہواؤں کے رخ پر ہچکولے کھاتا گزرے گا۔ خاندانی رقابتوں کی بھٹی میں سلگتا رہے گا یا وہ اپنے وارثوں کے خون آشام منصوبوں کی نذر ہو جائیں گے۔ بہر حال اب ان بیچاروں کی زندگیاں بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن تھیں۔ اور ایک عورت کے انتقام کے شعلوں میں سلگ رہی تھیں۔

رضا خان پڑھا لکھا لڑکا تھا، وہ بڑا طرحدار اور بانکا نوجوان تھا بچپن ہی سے سیماب صفت طبیعت کا مالک تھا اور کبھی بھی نچلا نہیں بیٹھتا تھا۔ چونکہ وہ گاؤں کے امیر ترین خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور پھر سمندر خان ملک کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اس لئے اس کی خو بو میں اپنے بڑے بھائیوں کی نسبت چودھراہٹ نمایاں تھی، جس کا وہ کئی مواقع پر عملی مظاہرہ بھی کرتا رہتا تھا۔

پورے گل آباد میں رضا خان کسی کو بھی اپنے پائے کا نہیں سمجھتا تھا۔ ایک تو وہ اتنا بہت سارا لکھ پڑھ چکا تھا اور کالج میں داخل تھا دوسرے وہ خوبرو اور شہ زور بھی تھا۔ اس کی شہ زوری ایک طرح سے سینہ زوری کے مترادف تھی۔ کہ گاؤں میں اس کے خاندان کا ہم پلہ کوئی نہ تھا، بس وہ جو بھی سلوک کسی کے ساتھ روا رکھتا، لوگ اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے گاؤں کے بعض ایسے خاندانوں میں کئی لڑکیوں کے ساتھ اس کے تعلقات تھے جو حیثیت میں اس کے خاندان سے کم تھے۔ لیکن یہ تعلقات صرف آنکھ کے اشاروں تک ہی محدود ہوتے تھے کہ رضا خان کے دونوں بھائیوں کو اپنے گاؤں کی بہنوں

اور بیٹیوں کی عزت کا پاس تھا اور وہ بات کو زیادہ آگے بڑھنے ہی نہ دیتے تھے۔ جونہی اس قسم کے کسی نازک معاملے کی اطلاع دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کو ملی، اس نے فوراً لڑکی کے باپ یا وارث کو بلا کر گاؤں کی عزت کا احساس دلایا اور لڑکی کے ہاتھ کہیں اور پیلے کروا دیئے اور اس طرح کبھی بھی محبت کی یہ پینگیں بڑھنے نہ پائیں اور رضا خان کی رنگین مزاجی اپنے مزاج کی رنگینی دکھانے کو سر پیر مارتی رہ جاتی۔ اس طرح اس گاؤں میں اس کی کوئی محبت بھی نقطۂ عروج تک نہ پہنچ سکی بلکہ اندر ہی اندر دبا دی جاتی رہی۔

رضا خان کالج میں اپنی طرح کے خوانین کے لڑکوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا اور ان کی عادتیں اپنا رہا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اسے کالج کے ہاسٹل میں بھیج دیا گیا تھا وہاں اس کا پالا ان لڑکوں سے پڑا جو صرف اپنا وقت گزارنے کالجوں میں داخل ہوتے تھے۔

ایسے لڑکے عموماً میٹرک تو ہوں توں کر کے پاس کر لیتے ہیں اور کالجوں میں داخلہ بھی مل جاتا ہے لیکن تعلیم سے ان کا مقصد پڑھ لکھ کر مفید شہری نہیں بننا ہوتا۔ بلکہ ایک طرح سے پڑھائی کی آڑ میں مستقبل میں پڑھی لکھی لڑکیوں کے ساتھ شادیاں رچانا ہوتا ہے جو عام طور پر ناکام ثابت ہوتی ہیں اور انجام کار اپنے والدین ہی کی پسند کی لڑکیوں کو بیویاں بنا کر یہ سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ ان لڑکوں کے اکثر والدین چونکہ خود ان مراحل سے گزر چکے ہیں اس لئے وہ اپنے بیٹیوں کی نگرانی کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں ہزاروں اور خاندانی بکھیڑے نپٹانا پڑتے ہیں، چنانچہ اس کا ایک سہل اور آسان طریقہ یہ ہے کہ بیٹیوں کو زیادہ سے زیادہ میٹرک یا الیف اے، بی اے کروا کر گھر پر بٹھا لیا جاتا ہے تاکہ کسی اور

خان کے بیٹے کا رشتہ آئے تو ہاتھ پیلے کروئے جائیں اور بیٹوں کو ہاسٹلوں میں داخل کروا کر ڈھیل دیدی جاتی ہے۔
اکثر والدین زعم میں آکر اور دوسرے خوانین سے اپنے آپ کو زیادہ امیر اور معتبر ثابت کرنے کی دوڑ میں اپنے پڑھنے والے بیٹیوں کو ان کی ضرورت سے زیادہ پیسہ بھجواتے ہیں اور دیتے ہیں۔ اور دیتے ہیں۔ اکثر لڑکے بھی مختلف حیلوں بہانوں سے گھروں سے پیسے منگواتے رہتے ہیں، جس سے ان کو من مانی کرنے اور کروانے کے خاصے مواقع ہاتھ آجاتے ہیں وہ مختلف بدعادتوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہر کلاس میں کئی کئی بار فیل ہوتے رہتے ہیں۔
لیکن ان لڑکوں میں اکثر وہ نیک بخت لڑکے بھی ہوتے ہیں جن کو یہ احساس ہوتا ہے کہ باپ دادا کی جائیداد ان فضول خرافات کا ساتھ سدا نہیں دے سکے گی۔ چنانچہ وہ واقعی پڑھائی کی خاطر ہی داخل ہوتے ہیں۔ جی لگا کر پڑھتے ہیں، اپنے گاؤں اور علاقے کے غرمست لڑکوں کا ساتھ بھی دیتے ہیں، لیکن گوہر مقصود اپنی مٹھی میں رکھ کر اپنے مستقبل پر نظر رکھتے ہیں اور پھر یہی لڑکے ایک نہ ایک دن اپنے علاقے کے نامی گرامی ڈاکٹر، پروفیسر، ماہرین زراعت، سائنس دان، سکالرز اور بڑے بڑے افسر بن جاتے ہیں اور پھر اپنی اولاد کی تربیت اور پرورش انہی خطوط پر کرتے ہیں جو زیادہ تعمیری ہوتے ہیں۔
عموماً ہوتا یوں بھی ہے کہ ساتھ پڑھنے والے لڑکوں میں دوستی اتنی گاڑھی ہو جاتی ہے کہ وہ چھٹیوں کے دوران ایک دوسرے کے گاؤں اور گھروں کو بھی جاتے ہیں۔ جن علاقوں میں شکار ملتا ہے شکار کرنے کے شوقین اور شکار کھانے کے شوقین، دونوں طرح کے لڑکوں

کی یلغار ان علاقوں کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ والدین بھی اپنی پرانی روایات کے تحت ان جیسے بُلائے اور بن بلائے مہمانوں کی خاطر داریوں کو اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مہمان لڑکے حجروں میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔ سیر سپاٹے ہوتے ہیں۔ شکار کئے ہوئے پرند اور جانور بھونے جاتے ہیں، کھائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی میزبان کے گھر کے مختلف قسم کے خوان بھی چٹ کر لئے جاتے ہیں یہ عمل باری باری ہر صاحب حیثیت اپنی استطاعت کے مطابق جاری رکھتا ہے۔

اُن علاقوں میں بھی مہمان لڑکے زیادہ نظر آتے ہیں، جہاں گنا پیدا ہوتا ہے، سردیوں کے موسم میں گھانیوں میں بننے والا گرم گرم گڑ جولا اور راب کھائی جاتی ہے جولا ایک قسم کا گڑ کا، جیونگم سمجھیں جیونگم کی مٹھاس چوسنے پر اُسے پھینک دیا جاتا ہے لیکن جولا سارے کا سارا کھایا جاتا ہے۔

اکثر خوانین کے بیٹے محض دکھاوے کے طور پر پڑھنے کے لئے داخل ہوتے ہیں ورنہ وہ عملی زندگیوں میں اپنی تعلیم سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ ہی ملک وقوم کے کام آتے ہیں۔ یوں سمجھ کہ ملک وقوم کا پیسہ ایسے افراد پر فضول ضائع جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسے افراد کو نہ پڑھائے جانے کا کوئی قانون فرض کیا لاگو ہو بھی جائے تو بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں سے کون کیا نہیں بنے گا اور کیا بننے والا ہے چنانچہ یہ سلسلہ سال ہا سال سے یونہی جاری ہے۔

پہلے تو پڑھائی پر اتنا زور نہیں دیا جاتا تھا لیکن اب ہوا کچھ ایسی چلی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ پیسہ زیادہ ہو گیا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی مصرف ہونا چاہیئے۔ لیکن جس زمانے کا ذکر ہم رضا خان کے ناطے سے کرنے چلے ہیں یہ

وہ زمانہ تھا جب تعلیم بہت عام نہیں تھی۔ لیکن سمندر خان ملک اپنی دولت کے بل بوتے پر تمام گاؤں بلکہ دور دراز کے علاقوں میں بھی اپنے آپ کو ہر لحاظ سے معتبر شخص ثابت کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے بیٹوں کو پہلے گاؤں کے مدرسے میں داخل کیا، پھر ان کے داخلے کا بندوبست اسلامیہ کالجیٹ ہائی سکول، پشاور میں کرایا مگر تینوں بیٹوں میں سے صرف رضا خان کالج تک پہنچ سکا۔ کالج کے زمانے کا ذکر ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سیر کی غرض سے مردان گیا ہوا تھا وہیں اس کی ملاقات جانے کس طرح زبیدہ سے ہو گئی اور پھر وہ ملتے رہے اور ایک دن وہ بھی آیا کہ زبیدہ اب سمندر خان ملک کے خاندان کی ایک فرد بننے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ جب تک اس کا شوہر عبیداللہ جان مارا نہ گیا تھا، رضا خان بھی اسے کھلے بندوں کہیں رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ کوئی اور لوگ ہوتے تو غالباً چوری اور سینہ زوری کے مصداق ایسا کرتے لیکن سمندر خان جو کچھ بھی تھا اپنے علاقے کے سفید پوش، با اثر اور عزت دار خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس لئے شروع میں اس کے دونوں بیٹوں محبت خان اور حبیب خان نے بھی اپنے بھائی رضا خان کا ساتھ نہ دیا لیکن جب انہیں یہ علم ہوا کہ زبیدہ ماں بننے والی ہے تو اب یہ بات ان کے لئے ایک چیلنج کا درجہ اختیار کر گئی خدا واحد شاہد ہے کہ عبیداللہ جان کے مار ڈالنے کی سازش میں یہ دونوں بھائی شامل نہ تھے اور شامل ہو بھی کیسے سکتے تھے کہ رضا خان کو اپنے بھائیوں کی طبیعت کا پتہ تھا لیکن اب وہ دونوں زبیدہ کو اس گھر کی باقاعدہ بہو بنانے پر رضامند ہو گئے تھے۔

ان دونوں نے سمجھ لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن زبیدہ سے

رضا خان کا جی بھر جائے گا وہ اسے چھوڑ کر محمد یوسف کی بیٹی ریبہ سے شادی کرے گا اور اس کے بیے ان دونوں نے اپنی سی کوشش بھی کیں وہ اسے اکساتے بھی رہے۔ چنانچہ ایک روز حبیب خان نے کہا:

"مرد دو تو کیا، چار چار شادیاں بھی رچاتے ہیں۔ زبیدہ بھی رہے، لیکن رفیہ بھی تمہاری منگیتر ہے۔ اچھا نہیں لگتا کہ وہ بھائیوں کے گھر بیٹھی ہو۔ تم اجازت دو تو دو لول ٹرھوا کر اسے لے آتے ہیں یا اجازت دو کہ اس کا رشتہ کہیں کر دیا جائے۔"

رضا خان نے بل کھا کر غصے میں بھائی سے کہا:

"کون ہے وہ ماں کا لال جو رضا خان کی امانت کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ بیوی بنانا تو دور کی بات ہے اور رہی یہ بات کہ بھائیوں کے گھر بیٹھی ہے تو اگر وہ بے غیرت کھلا نہیں سکتے۔ میں بھجوایا کروں گا۔"

لیکن ایسا کیسے ہو سکتا تھا آخر پشتون معاشرہ تے بھائیوں کے ہوتے ہوئے پرایا مرد ان کی بہن کے لئے نان نفقہ بھجوائے گا۔ یہ کبھی ہوا تھا اور نہ ہی ہو سکتا تھا۔

بات دراصل یہ تھی کہ زبیدہ ایک اذیت پسند عورت تھی وہ اوروں کو مصیبت اور تکلیف میں دیکھ کر خوش ہوا کرتی تھی۔ کسی کی موت کی خبر سنتی تھی تو اس کے اندر لڈو سے پھوٹتے تھے، جیسے مرنے والے سے اس کی اپنی جان چھوٹی ہے کسی کو جسمانی تکلیف میں دیکھتی تو اسے اطمینان ہوتا تھا۔ کسی کو آزار دے کر دلی سکون پاتی تھی۔ کسی کو ذہنی کرب میں مبتلا کر کے خوشیوں کے خزانے لوٹتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے شوہر عبید اللہ جان کی موت کا سنا تو گھی کے چراغ جلائے۔ اس لئے کہ اس طرح اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر ایک صلح کل

اور بے ضرر سا آدمی تھا لیکن خوش اس لئے ہوئی تھی کہ اب اس کی ساس اور نندوں کا کوئی سہارا نہ رہا تھا۔ اس کا کمسن دیور کلیم جان بڑا ہوگا اور ماں بہنوں کا سہارا بنے گا یہ شدنی ناممکن اس لئے تھی کہ اس کے ترلورے ان دونوں بھائیوں کے خون کے پیاسے تھے۔ لیکن بازو زیادہ مضبوط نہیں پائے تھے ورنہ کب کا عبیداللہ جان اور کلیم جان کو ختم کر چکے ہوتے۔

اور اب وہ فریضہ زبیدہ نے رضا خان کے ذریعے پورا کر دیا۔ اور سو سو خوشیاں منائیں۔ اُسے اپنی چھوڑی ہوئی ننھی سی جان بیٹی کا بھی خیال نہ آیا۔ بلکہ ایک طرح سے اس کے لئے بھی یہ سزا ناکافی سمجھ رہی تھی کہ وہ بن ماں باپ کے ترلوروں کے تھپیڑوں کا شکار ہوگئی۔ اسے سکون اس بات سے ملا تھا کہ اس کی بیٹی بھی آخر کو اسی خاندان کی ایک فرد تھی جس کے افراد سے اس نے اتنا بڑا انتقام لیا تھا۔

لیکن زبیدہ کے انتقام اور بغض و حسد کی بھٹی یہاں رضا خان کے گھر آکر بھی ٹھنڈی نہ ہوئی تھی بلکہ اب وہ اور بھی بھڑک اٹھی تھی اور اس بھٹی کا پہلا ایندھن بے زبان رقیہ اور اس کا خاندان بنا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس بے نام انتقام کی بھٹی کو مزید ایندھن پہنچانے کے لئے صحبت خان اور حبیب خان کے گھرانے موجود تھے۔ وہ اب گٹھ جوڑوں میں مصروف ہوگئی۔ گاہے گاہے بدنامی اور رسوائی کے تیر وہ رقیہ کی طرف پھینکتی گئی لیکن اس میں اسے زیادہ کامیابی اس واسطے بھی نہ ہو سکی تھی کہ سلیم جان اور رقیہ نے ایک بڑے بے ضرر سے منصوبے کے تحت حبیب خان کی چھوٹی بیٹی کا رشتہ اپنے چھوٹے بھائی کے لئے مانگ لیا جو منظور کر لیا گیا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد اس کا شوہر سلیم جان ڈیوٹی سے واپس گاؤں آرہا تھا کہ راستے میں دو

پارٹیوں میں کسی معمولی بات کی آڑ لے کر ایک بہت پرانی دشمنی کی بناء پر گولیوں کا تبادلہ ہو رہا تھا جس میں اسی گاؤں کی ایک عورت اور گل آباد کا حلیم جان نامعلوم قاتل کی گولیوں کا نشانہ بنے اور اس طرح حبیب خان کی چھوٹی بیٹی شہر بانو بیوہ ہوگئی اور ایک بیٹے کے ساتھ بیوگی کے دن بتانے لگی۔ سلیم جان نے اپنے سمدھی حبیب خان سے شہر بانو کی کسی اچھی جگہ دوسرے نکاح کی بات بھی کر لی تھی، وہ مان گئے تھے کیونکہ سلیم جان کا ایک رنڈوا ماموں زاد شہر بانو سے شادی کا خواہش مند تھا۔ اور ان کے گاؤں سے نیچے کی طرف صمد گڑھی میں خاصی زمینوں کے مالک کا بیٹا تھا لیکن شہر بانو نہیں مانی تھی اور اب اپنے سسرال میں بیوگی کے دن گزار رہی تھی اور عنایت اللہ خان اس کی اور اس کے بیٹے سجاد کی معقول طریقے سے کفالت کر رہا تھا۔

اُدھر زبیدہ نت نئے جال بن رہی تھی۔ سمندر خان ملک کے خاندان میں پھوٹ ڈلوا چکی تھی۔ پہلے صحبت خان اور حبیب خان نے مکان الگ کر لئے تھے۔ اب جائیداد بھی بٹ چکی تھی۔ اور رضا خان کل جائداد کے پورے تیسرے حصے کا قانونی حقدار ٹھہرایا جا چکا تھا۔ لیکن زبیدہ کے منصوبے یہ نہ تھے۔ وہ اس خاندان کو کسی حال میں اکٹھا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

پہلے رضا خان کو اس بات پر اکسایا کہ شہر بانو تمہاری بھتیجی کسی اور سے نکاح پڑھوا رہی ہے اور جب اُس کے انکار کا پتہ چلا تو یہ بات اس کے ذہن نشین کروانے لگی کہ سلیم جان اس کا جیٹھ اس سے دوسرا نکاح کرے گا اور یہ اُس خاندان کی بے عزتی ہوگی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ عنایت اللہ خان نے باتوں باتوں میں یہ بات رضا خان کے دماغ میں بٹھا دی کہ زبیدہ کا نکاح بھی تمہارے

ساتھ دوسرا نکاح ہے اُس شوریدہ سر کا تو یہ ایمان تھا اور زبیدہ نے اُس کو یہ باور کرا لیا تھا کہ اِس نے اس کی محبت میں یہ سب کچھ کیا تھا۔ اور اُس کے جواب میں اس نے زبیدہ کے والہانہ پیار کے طفیل رقیہ کے ساتھ شادی نہیں کی۔ ورنہ کونسی ایسی دوسری رکاوٹ ہو سکتی تھی۔ بہرحال یہ رضا خان اور زبیدہ کا ذاتی معاملہ جان کر بات آئی گئی کر دی گئی تھی۔ لیکن اِس کا کیا کیا جائے کہ وہ اب پوری جائیداد ہتھیانے کی فکر میں رہنے لگی۔

زبیدہ مردان کے نمان حکم خان کی بیٹی تھی۔ حکم خان درمیانے درجے سے ذرا اوپر کا خان تھا، زمینوں پر زیادہ تر نقد فصلیں اُگایا کرتا تھا، لیکن یہ فصلیں عام زمینداروں کے مقابلے میں کم قیمت میں فروخت کیا کرتا تھا۔ اکثر کھڑی فصلیں ہی بیچ دیا کرتا تھا ورنہ زمینیں اچھی تھیں، فصلیں بھی بہت اچھی ہوا کرتی تھیں اگر وہ ذرا بھی محنت کرتا، گڑ خود نکلواتا، تمباکو کی اپنی بھٹیاں لگواتا، تو پھر کہیں اچھے پیسے ہاتھ آ سکتے تھے۔ لیکن وہ تو جیسے تیار بیٹھا ہوتا، جہاں کسی فصل نے سر اٹھایا اور زمین سے چند انچ یا ایک دو فٹ گنا اُٹھ آیا وہاں اس کے گاہک اس کی فصل لے اُڑے اور خان پیسے جیب میں ڈال یہ جا وہ جا لاہور جا بیٹھتا تھا۔

ویسے خان کے ٹھکانے کا کسی کو بھی زیادہ صحیح علم نہیں تھا، کیونکہ وہ ایک جگہ ہو کر رہنا جانتا ہی نہ تھا، آج اس بائی کے کوٹھے پر ہے کل اس پری وش کو کرائے کا مکان لے کر دیا ہے، پرسوں شام تک ایک حسینہ کے ساتھ رہا، دوسری شام کسی اور خانم کے گھر سے نشے میں دھت اپنے کسی نوکر چاکر یا دوست کا سہارا لئے برآمد ہو رہا ہے۔

وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، اسکول میں مشکل سے دسویں تک

پہنچ سکا تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ کند ذہن تھا۔ پڑھائی کا شوق بھی رکھتا تھا لیکن باپ نے بچپن ہی میں حکم خان کی شادی کروا دی تھی کہ گھر میں اپنی بیٹی تھی نہیں، پانچ بیٹوں کا باپ تھا۔ چنانچہ حکم خان کی بیوی کو ایک طرح سے بیٹی کی کمی پوری کرانے لے آئے تھے۔

حکم خان کی بیوی مہتاب بے کے حسن کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے، سگھڑ بھی بہت تھی، لیکن تھی حکم خان سے چار پانچ سال بڑی۔ شروع شروع میں تمام گھر اس کے حسن سلوک کا معترف تھا، لیکن جانے کیا بات ہوئی کہ چند ہی برس میں حکم خان کا جی اُس سے بھر گیا۔ ایک وجہ تو یہ بھی تھی، کہ حکم خان کی شادی کے قریباً چار سال بعد دو اور بھائیوں کی اکٹھی شادیاں رچائی گئیں۔ شادی کے دوسرے دن سلام کرائی کے موقع پر چھوٹے بھائی کی بیوی حسن پری نے جونہی سلام کے لئے ہاتھ اٹھا کر ماتھے پر رکھا اور جیٹھ کو دیکھ کر مسکرائی تو حکم خان کے دل پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اور اس کا تمام وجود لرز کر رہ گیا۔ تب سے لے کر وہ حسن پری کے دام الفت میں گرفتار اِدھر اُدھر اندر باہر مارا مارا پھرتا رہا حسن پری نے اپنے شکار کا تڑپنا دیکھ لیا تھا، بھرے گھر میں اُسے اٹھا کر سینے سے تو نہ لگا سکی لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں کبھی اس کے زخم دل پر پھاہے رکھتی گئی اور کبھی ناز و ادا کے مزید تیر پھینک اس کے زخم اور گہرے کرتی گئی۔

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے پھر حکم خان جیسے بے صبرے عاشق سے کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ خاندان کے ناموس کی خاطر دل پر پتھر رکھ کر، یا تو خاموش ہو رہتا یا پھر باپ کا اصل جانشین ثابت ہوتا اور شیطان کے پھانسے میں نہ آتا۔ لیکن وہ تو ایسے نرغے میں پھنسا تھا کہ جب اس کے ضمیر نے اس کو جھٹکا دے کر چھڑانا چاہا تو ساتھ ہی خاندان کا شیرازہ بھی بکھر کر رہ گیا۔ چھوٹے بیٹے کو باپ نے خود ہی الگ

مکان دے کر دیا اور اس کے ساتھ اُٹھ آیا وہ ایک طرح سے اپنے طور پر بہو کا محافظ بن کر بیٹے کے ساتھ رہنے لگا تھا۔

حکم خان کے تیور سے ڈر کر باپ نے صُلح صفائی سے اپنی تمام زمین اور گھر دل کا بٹوارہ کر کے بات ہی ختم کر لی تھی۔ ابھی دو اور بیٹے غیر شادی شدہ تھے ــــــ اِن کا حصّہ ان کے نام لکھدیا اور خود گارڈین بن گیا۔

ماں اپنے پرانے مکان میں حکم خان اور دو غیر شادی شدہ بیٹوں کے ساتھ ہی رہ پڑی۔ ایک تو سب سے بڑا بیٹا تھا، ماں کو بہت پیارا تھا، دوسرے وہ شوہر کی یہ منطق ماننے کو تیار ہی نہیں ہو سکتی تھی کہ حکم خان شرافت کی حدود پھاند کر بھاوج سے تعلقات استوار کر چکا ہے اور اب ان دونوں کو ایک جگہ رکھنا آگ اور روئی کو اکٹھا رکھنے کے مترادف ہے۔

اِدھر حکم خان کی آنکھوں پر اپنی زندگی کی پہلی محبت کی ایسی پٹی بندھی تھی کہ اس کو اپنی بیوی مہتابہ اور بچے اب نظر ہی نہیں آ سکتے تھے، جب باپ نے خاندان کی عزت کا واسطہ دے کر اس پر تیسرے بھائی شبیر خان کے گھر کا دروازہ بند کیا تو اس نے لاہور کا راستہ اختیار کر لیا۔ اب ہر فصل اپنے حصّے کی زمینوں کی پیداوار کا نقد وصول کر کے نئے نئے ٹھکانے ڈھونڈتا پھرتا اور زیادہ وقت لاہور میں گزارتا۔

مہتابہ ٹھنڈی مٹی کی بنی ہوئی دھیمے مزاج کی عورت تھی۔ اس نے کسی بات کا کبھی بھی بُرا نہ مانا۔ شوہر گھر پر آیا چاہے چند ہی روز کے لئے کیوں نہ آیا، یہ اس کی اسی طرح خدمت کرتی جس طرح ایک شوہر پرست بیوی کیا کرتی ہے کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی ساس مجبور کرتی تب، سمجھاتی رہی۔

"دیکھو خاوند کو مٹھی میں کرلو، پھر پچھتاؤ گی، مرد ذات ہے، مرد کے لئے عورت جوتی برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی، وہ سیانے کہہ گئے ہیں سر سلامت ٹوپیاں ہزار"۔

لیکن مہتابہ کے رویئے میں ذرا بھی فرق نہ آتا، اس کے ماتھے پر شکن تک نہ ابھرتی، وہ حکم خان کو ایک ضدی بچہ سمجھ رہی تھی۔ مہتابہ کئی بار حکم خان کے لئے اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات موجزن پاتی تھی۔ شادی ہوجانے کے بعد سے ہی اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ حکم خان اس سے عمر میں بہت چھوٹا ہے۔ وہ اس کا شوہر ہوتے ہوتے بھی اس کے لئے چھوٹا ہی رہا حالانکہ وہ حکم خان ہی کے بچوں کی ماں بنتی رہی، لیکن اُسے واقعی اپنے شوہر سے دلی ہمدردی تھی۔ اور تبھی تو جب حسن پری اور حکم خان کے عشق کی بات گھر کی چار دیواری سے نکل باہر کے لوگوں کی زبان پر آگئی تو اس نے بُرا ماننے کی بجائے اپنی ماں کے پوچھنے پر جواب دیا تھا۔

"اوّل تو ایسی کوئی بات ہوگی نہیں اور اگر ہوئی بھی ہو تو حکم خان اور حسن پری کی عمروں میں اتنا فرق نہیں ہے، زیادہ بُرا بھی نہیں لگتا"۔

اور اس کی ماں جزبز ہو کر رہ گئی تھی۔

لیکن ساس کب یہ برداشت کر سکتی تھی، اوّل تو مہتابہ نے ساس کے ساتھ کبھی زبان چلائی نہیں تھی بس تمام دن گھر کے کاموں میں جُتی رہتی تھی لیکن جب ساس نے دیکھا کہ بیٹا ہاتھ سے نکلا جارہا ہے تو وہ اس کی تمام تر ذمہ داری اس کی بیوی مہتابہ پر ڈالنے لگی۔ شروع شروع میں اشاروں کنایوں سے سمجھاتی رہی، پھر ایک روز آیا کہ اُبل پڑی۔

"دیکھ نا تے تم اس کی ماں نہیں بیوی ہو، مرد کے صرف دل پر نہیں بلکہ پلنگ پر بھی قبضہ رکھنا پڑتا ہے۔ تم میں کیا نہیں ہے، جو دوسری عورتوں میں ہے؟

عورت ہو، کیوں اپنی عاقبت خراب کر رہی ہو! میں تواں دور دراز کے خالزادوں کی بہن بیٹیوں میں سے حسین ترین لڑکی چن کر اس گھر میں لائی تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ سرد مٹی کا بنا ہوا کھلونا نکلو گی۔"

زبیدہ جواب سیانی ہو چکی تھی۔ روز روز اس قسم کی باتیں سنتی رہتی اور کڑھتی رہتی۔ آخر ایک روز اس کا بھی منہ کھل گیا اور ماں سے کہا۔

"ماں دادی جان سچ کہتی ہیں نا دیکھو سب چچیاں کس طرح اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ تم تو نوکرانی بن کر گزارہ کر رہی ہو لیکن ہم کو نوکروں کے بچوں جیسی نظر سے بچالو۔"

مہتابہ نے ہنس کر بات ٹالنے کی کوشش کی، لیکن اب زبیدہ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"ماں ہمیں ہمارا باپ واپس دلواؤ"

اور باپ ان سے اور دور ہوتا گیا۔

اب زبیدہ کے لہجے میں ماں کے لئے تلخی آگئی تھی۔

"ماں تم کیسی عورت ہو؟ کیا ہم تمہاری اولاد نہیں ہیں تم ہمارے لئے کچھ بھی نہیں کرو گی" اب پانی سر سے گزر چکا تھا اور وہ دن بھی آیا کہ چھوٹے دیور کی ہمدردیوں کو چھوٹی بہو نے شک کی نظر سے دیکھنا شروع کیا اور آخر کو وہ ایک روز پھٹ پڑی۔

"خاوند نے بھاڑ سے رنگ رلیاں منائیں، بیوی کو بھی گھر میں موقعہ ہاتھ آیا اور میرے پلنگ پر چڑھ آئی، میں بھی تو ہوں، شوہر تو ایک آدھ رات یہاں گذار کر چلا جاتا ہے وہ تو تھوکتا بھی نہیں تم پہ، جہاں ای ہر سال یہ شہزادے، شہزادیاں کہاں سے ٹپک پڑتی ہیں؟"

مہتاب ہے زبان سے اپنے حق میں ایک لفظ تک نہ نکالا۔
لیکن ساس۔ نے جوتا ضرور نکالا اور مہتاب کی خوب مرمت کی اور اب
ہر روز یہ پریکٹس جاری تھی۔ مہتاب گالیاں اور مار کھاتی اور زبیدہ پیچ وتاب۔
اب اُس کو اپنی ماں سے ایک قسم کی نفرت ہو چکی تھی، جس نے اپنے
حق میں ایک لفظ تک اپنے منہ سے نہ نکالا۔ اُس کو اپنی دادی سے نفرت
ہو گئی تھی جو جوتے کی نوک پر بہو کو اس کا حق بتاتی تھی۔ اُس کو اپنی چچیوں سے
نفرت ہو گئی تھی، جو اپنا حق منوانے کے لئے اُس کی ماں کو جوتے پڑواتی
تھیں۔ اس کو اُن اَن دیکھی عورتوں سے نفرت ہو چکی تھی جن کی کہانیاں وہ
بارہا لوگوں سے سن چکی تھی اور جنہوں نے اس کے باپ کو قابو میں کر
رکھا تھا۔

اب زبیدہ کے لئے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا مشکل
لگ رہا تھا، وہ روز روز ماں سے لڑنے لگی۔
"ماں تم اور کچھ نہیں کر سکتی ہو، تو رو تو سکتی ہو نا!"
اور ماں یہ سن کر مسکرا دیتی۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز، پچھتاوے، دکھ
یا مایوسی کی کوئی رمق تک زبیدہ کو نظر نہ آتی اور سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس
کی ماں کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔
"ماں میں اگر مرد ہوتی نا، تو دنیا کی ان تمام عورتوں سے تمہارے
بدلے لیتی جو تم پر زیادتیاں کرتی ہیں!" اور ماں پیار بھری نظروں سے
بیٹی کی بلائیں لیتی۔
"ماں مجھے ایسی نظر سے مت دیکھا کرو۔ مجھے تمہاری ایسی حرکتوں
سے نفرت ہو چلی ہے!"
اور زبیدہ سسک کر رہ جاتی
وہ اکثر سوچا کرتی ہے،

" اگر اس کا باپ ایسی حرکتیں کرتا ہے تو یہ قصور اس کی ماں کا ہے۔ وہ کیوں اپنا حق نہیں چھینتی، وہ کیوں اور عورتوں کی طرح عورت نہیں بنتی"

جوں جوں وقت گزرتا گیا، زبیدہ کے دل میں عورت ذات سے نفرت کا بیج جڑ پکڑتا گیا، نفرت کا پودا پھلتا پھولتا گیا اور اتنا بڑھا کہ زبیدہ کو اپنی ذات بھی اس پودے کے سائے میں آگ کا ایک دھکتا انگارہ نظر آنے لگی۔ وہ خود سے بھی نفرت کرنے لگی۔

" ماں تو نے پیدا کرتے ہی میرا گلا کیوں نہ دبایا' میں کیوں عورت ہوں، میں مرد کیوں نہ ہوئی "

انہی قسم کے احساسات اور جذبات تلے زبیدہ جوان ہوئی اور اس کی شادی مردان ہی کے عبیداللہ جان سے کر دی گئی۔ اور نفرت کا جو لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا تھا اب آتش فشاں کے پھٹنے سے خود بخود باہر کو آ گیا اور زبیدہ نفرت وحقارت کی ایک کھولتی ہوئی بھٹی بن گئی۔ نفرتوں کی اس بھٹی میں زبیدہ عبیداللہ جان کی ماں بہنوں کو جھونک کر خود رضا خان کے ساتھ بھاگ گئی۔

رضا خان ایک بگڑے ہوئے خان کی بے راہ روی کی زندگی گزار رہا تھا، ریس کھیلتا تھا، جوا کھیلتا تھا۔ زبیدہ سے چوری چھپے دوسری عورتوں پر بھی روپے پیسے ضائع کرتا تھا۔ فلمیں خود بھی دیکھتا تھا اور دوست احباب کو بھی اس نعمت سے نوازتا تھا اور ان کا پورا خرچہ خود اٹھاتا تھا۔ غرض اپنی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا تھا۔ اسی دوران میں گل شافعہ کی پیدائش ہوئی، لیکن زبیدہ کو جانے کون سے جن چمٹ گئے تھے کہ اس کو ایک ایسی چپ لگ گئی جس کی مہر جان کنی کی اذیت ناک حالت بھی نہ توڑ سکی۔

وہ نزع کی سی حالت میں اپنے پورے جسم کو اس انداز سے بل دیتی تھی کہ لگتا تھا جیسے سفید لٹھے کے تھان سے پانی نچوڑا جا رہا ہو، اس کے ہونٹ سیاہ پڑ چکے تھے، سانس سینے میں اٹک کر رہ گیا تھا اور دھونکنی کی طرح چلتا تھا۔ تھوڑی دیر کو وہ پُرسکون لگنے لگتی، آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ کلمۂ شہادت پڑھ لیتے تھے لیکن کچھ ہی گھڑیاں نہ ہوتی تھیں کہ وہ پھر ان ہی تکلیف دہ لمحات کی چکر پھیریوں میں پڑ جاتی تھی۔ وہ کسی کی بات سن سکتی تھی اور نہ ہی کسی کی بات کا جواب دینے کی سکت رکھتی تھی۔ بڑی بوڑھیاں تو یہاں تک

کہہ گئیں کہ اس کو کسی کا انتظار ہے، لیکن وہ کون تھا جس کا اُسے انتظار تھا یہ کوئی بھی برملا نہ کہہ سکتا تھا۔

ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ مریضہ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے، بہت علاج کرایا گیا، پیسہ پانی کی طرح بہا لیکن وہ جانبر نہ ہوسکی۔ آدھی سے زیادہ جائداد تو اُس طرح ہاتھ سے نکل گئی۔ باقی رہی سہی جائداد کا غم ہلکا کرنے کے بہانے رضا خان نے کھوئی اور ابھی اس کی بچی بلوغت کی عمر کو پہنچی بھی نہ تھی کہ وہ سر مزید بیٹ کر ابدی نیند سو گیا۔

اپنی تمام باغیانہ عمر میں رضا خان نے اپنی جائداد کی ایک انچ زمین بھی بھائیوں کے ہاتھ فروخت نہیں کی تھی۔ محبت خان اور حبیب خان نے بارہا بھائی کو مالی امداد کی پیش کش کی تھی، لیکن ہر بار اس نے یہ پیش کش بڑی حقارت سے ٹھکرا دی تھی۔ انہوں نے یہ بھی کئی بار کہلوایا تھا کہ زمین باہر کے لوگوں کے ہاتھ نہ بیچے لیکن وہ جواب دیتا۔ "میں اپنے باپ دادا کی ہڈیاں بھائیوں کو کیوں بھنبھوڑنے دوں، جائداد میری اپنی ہے چاہے کمہار کے ہاتھ بیچوں یا چمار کے ہاتھ اُس سے کسی کو کیا غرض ہے؟"

اور بھائیوں نے یہ راستہ اختیار کیا تھا کہ رضا خان جونہی زمین بیچ دیتا، دونوں بھائیوں میں سے ایک نہ ایک حق شفعہ استعمال کر کے زمین واپس لے لیتا۔ اب تو رضا خان کی زمین کے بہت سارے خریدار پیدا ہو چکے تھے۔ ہوتا یوں تھا کہ قبالہ جات میں ڈیوڑھی اور دوگنی قیمت لکھ دی جاتی لیکن رضا خان کو اصل ادائیگی کم ہوتی۔ خریدنے والے کو فائدہ یہ ہوتا کہ وہ حق شفعہ کے ذریعے صحبت خان اور حبیب خان سے کاغذات میں لکھی ہوئی پوری رقم ہتھیا لیتے اور اس طرح گنگا الٹی بہتی گئی سمندر

خان ملک کی بٹی ہوئی جائداد کا تیسرا حصہ جس کا رضا خان مالک تھا
محبت خان اور حبیب خان کے پاس آگئی لیکن دوگنی تگنی قیمت ادا
کرے۔

رضا خان کے مرنے کے بعد اس کی بیٹی گُل شافعہ اپنے تایا صحبت خان کے زیر سایہ آگئی تھی۔ گل شافعہ کو باپ سے تھوڑی سی زمین اور ایک دو مکان جو بچ رہے تھے ملنے تھے، لیکن پشتونوں کے اپنے خود ساختہ قانون کے تحت وہ اِس کی وارث نہیں سکتی تھی بلکہ اب تو وہ خود ایک وارثت تھی، جس کا حقدار صحبت خان کا بیٹا کریم خان قرار پاتا تھا اور کریم خان سے گل شافعہ کی شادی کر دی گئی۔ گل شافعہ کو باپ کی جائداد سے تو کچھ نہیں ملا تھا لیکن اِس نے ماں باپ دونوں سے تندمزاجی اور فضول خرچی وراثت میں لے لی تھی۔ شادی ہو جانے کے بعد وہ اپنی نندوں اور سسر سے بہت بُرا برتاؤ کرنے لگی تھی سسر کا وہ بظاہر کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی، لیکن اُٹھتے بیٹھتے وہ وہ کوسنے سناتی رہتی، جسے سن کر شریف آدمی کو خود ہی شرم آجاتی تھی۔

صحبت خان نے اپنی اور بیٹیاں بیاہ دی تھیں، لیکن مہر النساء ابھی کمسن تھی اِس کی بات صحبت خان نے اپنے طور پر حبیب خان کے بیٹے عنایت اللہ خان سے ٹھہرا لی تھی۔ لیکن مہر النساء ابھی چھوٹی تھی۔ صحبت خان کے نزدیک بہن بیٹی کو چھوٹی عمر میں بیاہنا ظلم کے مترادف تھا، لیکن جب بات حد سے بڑھنے لگی تو اُس کو اپنی

بیٹی چھوٹی ہی عمر میں بیاہتے ہیں۔

اب گل شافعہ کے لئے راستہ صاف ہوگیا تھا، وہ اپنی مرضی سے گھر کو چلانے لگی تھی۔ وہ اب تین چار بچوں کی ماں بھی بن چکی تھی لیکن مہرالنساء کے ناکردہ گناہ کو بھولی نہیں تھی، اور تب سے تو وہ مہرالنساء اور اس کے شوہر عنایت اللہ خان کی اور بھی جانی دشمن بن گئی تھی جب سے تایا نے پیدائش سے پہلے ہی مہرالنساء کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کو بہویا داماد بنا لیا تھا۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ مہرالنساء کے ہاں بیٹی زیب النساء پیدا ہوئی۔ اور اس طرح زیب النساء گل شافعہ کے بیٹے شفیق کی از خود منگیتر بن گئی۔

گل شافعہ کے راستے کی آخری رکاوٹ اس کا خسر صحبت خان چند روز بیمار رہنے کے بعد چل بسا اور اب تمام سیاہ و سفید کی مالک صرف اور صرف گل شافعہ اور یا اس کا شوہر کریم خان تھا۔ اور عنایت خان کی بیٹی کی سسرال اب عنایت کی جائداد اور زمینوں پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

زیبو اور شفیق کی منگنی اگر ظاہر نہ کی گئی ہوتی تو عنایت خان کبھی بھی اپنی بیٹی کا ہاتھ شفیق جیسے ناخلف اور نالائق لڑکے کے ہاتھ میں نہ دیتا۔ دوسری طرف مہرالنساء جس کا پیار کا نام مہرو تھا اپنے بھتیجے کی طرف زیادہ جھکی ہوئی تھی اور زیبو ماں اور باپ کی سرکشی کی سی اس کیفیت میں ڈانواں ڈول اپنے حق میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔ اس نے میٹرک کے بعد آگے پڑھنا چاہا تھا، لیکن اس کی یہ چاہت غلط روایات کی چکی میں دو تین سال ہوئے کچل دی گئی تھی۔ اگر باپ کی کاوشیں بار آور ثابت ہوئی

ہوتیں تو آج وہ انٹر کا امتحان پاس کر چکی ہوتی۔

زیبو ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی، اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کا، اپنے طور پر ایک نیا طریقہ نکال لیا تھا۔ اور پولٹری فارم کھول لیا تھا۔

اس کے اپنے مکان سے ملحقہ ایک دو درمیانہ گنجائش کے مکانات تھے۔ ان میں سے ایک مکان میں اس نے مرغیوں کی افزائش کے بارے میں لٹریچر پڑھ پڑھ کر ایک مرغی خانہ کھول رکھا تھا۔ پھر اردگرد کی زمین میں سایہ دار اور پھل دار درخت لگائے تھے۔ ساتھ والے دوسرے مکان میں زمین ٹھیک کر کے موسمی سبزیاں اگائی تھی اور سبزیوں کی کیاریوں میں جگہ جگہ شہد کی مکھیوں کے چھتوں کے ڈبے رکھے تھے۔ اسی مکان کا نصف حصہ اس نے بھیڑ بکریوں کے لئے تیار کر دیا تھا لیکن اچھی نسل کی بھیڑ بکریاں فی الحال دستیاب نہیں تھیں، چنانچہ اس جگہ اس نے دو چار عام قسم کی بھیڑیں اور بکریاں رکھی تھیں، کچھ جگہ میں اس نے کھاد جمع کر رکھی تھی اور نیبری سے لگائی جانے والی سبزیوں کی نرسری اور ساتھ ہی مختلف پودوں کی نرسریاں بنا رکھی تھیں۔

زیبو ایک باشعور لڑکی تھی، وہ بہت حسین تو نہ تھی لیکن قبول صورت ضرور تھی اور پھر سینے میں ایک ہمدرد اور دردمند دل اور سر میں ایک بیدار ذہن رکھتی تھی۔ وہ کتی اوصاف کی مالک تھی۔ نہ زیادہ بولتی تھی نہ ہی کم گو مشہور تھی، کسی نے مشورہ مانگا، اسے صحیح مشورہ دیدیا ورنہ اپنے طور پر کبھی بھی کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتی تھی۔ نہ خود بیکار بیٹھی تھی اور نہ دوسروں کو بیکار بیٹھے چارپائیاں توڑتے دیکھ سکتی تھی۔ اسے یہ تجربہ اپنے جیسے متمول

خاندانوں کی خواتین سے میل ملاپ ہی ہو چکا تھا۔ جو گھر کا سارا کام اپنے نوکروں سے کرواتی تھیں اور خود یا تو دن بھر کھاتی رہتی یا پھر آرام سے بیٹھی اپنے اوپر چربی کی تہ چڑھاتی رہتی تھیں اور اسی لئے وہ اپنی ماں کو کبھی بھی فضول چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ اس کی ماں مہرو ایک نارمل سے جسم کی خوبصورت عورت تھی۔ زیبو نے رنگ اپنے باپ سے لیا تھا اور نقش اپنی ماں پر تھے۔ وہ باپ سے اوصاف حمیدہ بھی وراثت میں لے چکی تھی اور اپنے باپ ہی کی طرح ایک باعمل تعمیری ذہن کی لڑکی تھی۔

اس کا باپ اکثر اپنی بیٹی کے بارے میں سوچتا رہتا ایک روز مہرو اور عنایت بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ عنایت نے بڑے افسوس سے کہا:

" کاش تم نے راستہ نہ روکا ہوتا یا میں تمہاری ناک کی لاج نہ رکھتا، اور زیبو کو آگے بڑھنے کا موقع دے دیتا زیبو بیٹوں والا کردار ادا کر رہی ہے، دیکھو تو ...."

مہرو نے شوہر کی بات کاٹ کر جواب دیا۔

" لاکھ بیٹوں والا کردار ادا کرے آخر کو تو اُسے اس گھر سے رخصت ہونا ہی ہے۔ اللہ نصیبہ اچھا کرے"

اس موقع پر عنایت کے منہ سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

" کوئی اور دعا مانگو، زیبو کے نصیب شفیق کے ساتھ پھوٹے ہی سمجھو"

" اللہ نہ کرے اگر اتنے مایوس ہوتے ہو تو تڑواؤ منگنی ہمارا کیا بگاڑ لیں گے وہ لوگ، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہم زیبو کی شادی کسی دوسری جگہ کر سکیں گے۔ یہ تو خدا مغفرت کرے ابا جی

کی، انہوں نے سمجھو ایک طرح سے ہمارے ساتھ زیادتی کی تھی، ورنہ زیبو کب خوش ہے!"

مہرو نے شوہر کی بات کے جواب میں کہا۔

"ہاں سچ میں تو یہ پوچھنا بھول ہی گیا تھا کہ اب زیبو کی طبیعت کیسی ہے؟ کہیں بخار ہی میں تو چتری مرغی کے بچّے دیکھنے نہیں گئی ہے، بھاگ کر!"

عنایت اللہ خاں نے اچانک بیوی سے پوچھا۔

بڑی دیر بعد اس کا موڈ کچھ درست ہوا تھا اور پاؤں اوپر پلنگ پر رکھ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔

مہرو کا بھی شوہر کا بدلتا موڈ دیکھ لہجہ بدل چکا تھا۔

"زیبو کے ابا کیا بتاؤں، مرغیوں کے نیچے رکھے انڈوں سے بچّے نکل آئیں تو زیبو کچھ روز تندرست رہے گی، گائے بکری نے بچہ دیا تو زیبو کا بخار مہینہ ڈیڑھ کے لئے بھاگ جائے گا اور اگر چھتوں میں شہد تیار ہوا اور شہد جمع کرنے کا کام کرنا پڑا تو زیبو کچھ عرصہ بیماریاں بھولی رہے گی۔ نہ بخار ہوگا، نہ سر میں درد، نہ بدن میں درد اور نہ ہاتھ پاؤں دُکھیں گے۔ بس ذرا کی ذرا ان جھنجھٹوں سے فارغ ہوئی اور بیماریوں کی یلغار شروع ہوئی۔ یہ آج نزلہ ہے کل بخار تھا، سر میں درد ہے، بدن میں اینٹھن ہے اشتہا ختم ہوگئی ہے۔

دلوں بھوکی پڑی رہے گی۔ یہ کیا زندگی ہوئی؟ میں تو تنگ آگئی اللہ کی قسم اس کی روز روز کی حالت دیکھ کر۔"

جب مہرو یہ آخری جملے منہ سے نکال رہی تھی تو اس کی آواز گلوگیر ہوگئی تھی اور اب اس نے باقاعدہ آنسو بہانے شروع

کر دیئے تھے۔ عنایت خان سمجھ گیا تھا کہ مہرو زیبو کی حالت سے واقعی غم زدہ ہے، ورنہ وہ آنسو کبھی نہیں بہاتی۔" اس کے آنسو ہی تھے جو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے رس رس کر باہر کو آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد عنایت کی آواز ابھری۔ غالباً وہ مہرو کی تشفی کرنا چاہ رہا تھا۔

"گھر میں اکیلی ہے،" اس کی تنہائی بانٹنے کو افروزہ کافی نہیں ہے۔ یہ اس کا ایک مشغلہ ہی سمجھو، بہلی رہتی ہے۔"

"نا یہ کیسی بیماری ہے، علاج کراتے کراتے عاجز آ چکے، دوا دارو کے ساتھ ساتھ تعویذ گنڈے بھی کرا رہے ہیں۔ آخر ہو گا کیا؟"

مہرو نے آنسو پونچھتے ہو شوہر سے سوال کیا۔ عنایت کے پاس ایسے سوال کا کیا جواب ہو سکتا تھا وہ خود حیران تھا کہ دو تین برس سے زیبو مختلف عارضوں میں مبتلا ہے ڈاکٹر بھی اس کی بیماری کو کوئی خاص نام نہیں دے سکتے۔ بدن میں درد، سر میں درد، پیٹ میں درد تو سمجھ میں تھوڑا بہت آسکتا ہے کیونکہ جو چیز نظر نہ آئے اور جو بیماری دوسرے محسوس نہ کر سکتے ہوں اس کے بارے میں یہ مان لیا جاسکتا ہے کہ بہانہ ہوگا۔ لیکن اس اچانک ایک سو دو اور ایک سو تین بخار سے کیسے درگزر کیا جاسکتا ہے۔ جس میں زیبو عموماً مبتلا رہتی ہے ایکسرے صاف ہوتے ہیں۔ خون، پیشاب، تھوک وغیرہ کے ٹسٹ نیگٹو ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے یہ کیسی بے نام بیماری ہے؟

اور اسے یاد آیا کہ پچھلے ہفتے شہر سے عنایت کا دوست رشید بمعہ بیوی بچوں کے جو چند روز گزارنے آیا تھا۔

اس نے کسی ڈاکٹر کا ذکر کیا تھا کہ وہ دوا دینے کے علاوہ ذہنی بیماریوں کا بھی علاج کرتا ہے اور آج تک جو بھی مریض اس کے پاس گیا ہے، وہ بالکل تندرست ہے اور کسی اور ڈاکٹر کے پاس پھر کبھی نہیں گیا۔ اور نہ ہی اس کے پاس دوبارہ علاج کے لیے آیا ہے۔ اس لیے اس کا خیال ہے کہ زیبو کو اس کا علاج اس ڈاکٹر سے کروایا جائے۔

لیکن مہرو کو یہ بات اچھی نہ لگی اس نے جلدی سے کہا "اللہ نہ کرے، میری زیبو کوئی پاگل ہے!"

"میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ دوا بھی دیتا ہے اور ذہنی بیماری کا علاج بھی کرتا ہے"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ اللہ نہ کرے کہ زیبو پاگل ہو یا ذہنی مریضہ ہو، باپ ہو کر ایسی باتیں منہ سے نکال رہے ہو، کوئی دوسرا کہتا تو بات بھی تھی۔ پرائی امانت ہے سسرال والوں نے سنا تو جانے کیا غضب ڈھائیں نا"

مہرو کی آواز اتنی اونچی ہو چکی تھی کہ رسوئی میں بیٹھی ہوئی افروزہ بھی چونکی ہو گئی۔ وہ موقع کی نزاکت جان چکی تھی چنانچہ بات کو اور آگے بڑھانے سے قبل ہی چائے لے آئی۔ اور دونوں چارپائیوں کے درمیان بچھی ہوئی میز پر لا کر رکھدی۔ پیالیاں بھر نے لگی تھی کہ مہرو نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو، چائے میں خود پیالیوں میں ڈالوں گی تم جاؤ اور زیبو کو بلا لاؤ۔ اب جو زدں کے دیدار کے لئے وہاں بیٹھی تو نہ رہے نا۔ باقی کام زرتاج اور کا بلتے بہو سنبھال لیں گی۔ میں ذرا اونچے محلے بھی جاؤں گی۔ تم تیار ہو جاؤ میرے ساتھ چلنے کو!"

" جی اچھا، بی بی جی" افروزہ نے جواب دیا اور زیبو کو بلانے مرغی خانے کی طرف چل پڑی۔

جب افروزہ جا چکی تو عنایت نے بیوی سے کہا۔

" آج ہی اونچے محلے جانے کی کیا ضرورت پیش آئی، کریم خان اور گل شافعہ سے میری خاصی گرما گرم گفتگو ہو چکی ہے ضرورت مند ہیں تو وہ ہیں، غلطی اُن کی تھی۔ میں شفیق کو ایسے لوگوں کے جھرمٹ میں دیکھ کر، اگر آپے سے باہر ہو گیا تھا تو ان میاں بیوی کو بیٹے کی طرف داری نہیں کرنی چاہئے تھی اب تم جاؤ گی تو سمجھ لیں گے کہ میں نے تم کو بھیجا ہے اور یہ کہ میں اپنی کہی ہوئی باتوں پر پچھتایا ہوں۔ کجو قطعی غلط ہو گا؟

" چلو ٹھیک ہے، جس طرح تم کہو، نہیں جاتی"

غالباً افروزہ نے خان بابا اور زیبو کی ماں کی باتیں سن لی تھیں اور اس کے کان تک تھوڑی بہت بھنک بھی پہنچ گئی تھی کیونکہ جب زیبو اپنے فارم سے گھر کی طرف پلٹی تو خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ لیکن ماں باپ کا خوشگوار موڈ دیکھ کر ذرا سنبھلی اور افروزہ کو خشمگیں آنکھوں سے گھور کر دیکھا۔

عنایت اتنی دیر میں بیوی کو بتا چکا تھا کہ کل پرسوں وہ زیبو کو ڈاکٹر خلیل کے پاس لے جا رہا ہے، جس کا پتہ اس کے دوست رشید نے اُسے بتایا تھا۔

رشید جس کا اصل نام محمد رشید اعوان تھا۔ عنایت اللہ خان کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ اُن کی دوستی اتنی پرانی نہیں لیکن اتنی نئی بھی نہیں سمجھی جا سکتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کی فطرت سے ناواقف ہوتے۔ رشید کی پشاور شہر میں بجون

کی دکان تھی۔ عنایت اللہ خان رشید ہی کی دکان سے مختلف پھلوں، پھولوں اور سبزیوں کے بیج خریدا کرتا تھا۔ اور اس طرح ان کی شناسائی دوستی میں بدل چکی تھی۔ چنانچہ کبھی کبھار رشید شہر کے ہنگاموں کو چھوڑ کر بیوی بچوں سمیت چند روز گاؤں میں گزارنے عنایت کے گھر آجاتا تھا۔ عنایت کی بیوی ایک شوہر پرست مہمان نواز عورت تھی، ان کی توفیق بھر مدارات کرتی اور جب وہ گھر کو لوٹتے تو ساتھ مکئی کا آٹا، پشتیرے کا سوکھا ساگ، موسمی پھل اور سبزیاں اور ساتھ ہی اپنے فارم کے انڈے اور خالص شہد دے دیتی۔ اکثر سردیوں کے موسم میں سادہ گڑ، گری مصالحے والا گڑ، گڑ کے شربت کا گھڑا اور چولا کی ہنڈیا بھجواتی رشید کی بیوی زمردی بھی ان تحائف کے بدلے میں لنڈی کوتل سے زیبو اور مہرو کے لئے دوپٹے اور قمیضیں منگوا کر بھجواتی۔ کبھی کبھی تلے دار پشاوری چپل کے ایک دو جوڑے بھی خرید دیتی ایسے تحائف کے تبادلے ایک معمول بن چکے تھے۔

مہرو بہت کم شہر جاتی تھی۔ کیونکہ شہر کے تنگ اور اونچی اونچی سیڑھیوں والے گھروں میں اس کا جی گھبراتا تھا، وہ جب جاتی ایک رات سے زیادہ کبھی بھی شہر میں نہ ٹھہرتی تھی۔ یہی حال زیبو کا بھی تھا بلکہ زیبو تو جب چھوٹی تھی اور یہ لوگ شہر شادی بیاہ یا کسی اور موقعہ پر رشید کے گھر آئے ہوتے تو ضرورت کے لئے بھی کبھی تیسری اور چوتھی منزل پر نہ چڑھتی۔ اوپر آسمان سے باتیں کرتی چھت پر چڑھنا اب بھی اسے برا لگتا تھا۔ اور شہر میں زیادہ ٹھہرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ جب بھی شہر میں رشید کے ہاں ماں بیٹی آتیں تو دونوں کی طبیعت بگڑ جاتی۔ اس واسطے اب زیادہ تر رشید کے گھر والے ہی آتے تھے اور کھلی فضا میں چند دن گزار کر واپس چلے جاتے

تھے۔ پچھلے دنوں رشید اور اس کے گھر والے اسی طرح کے سفر پر گاؤں آئے تھے تو عنایت نے رشید کو زیبو کی طبیعت کی ناسازی کا ماجرا سنایا تھا اور تب اس نے ڈاکٹر خلیل کا پتہ بتایا تھا۔ کل پرسوں عنایت اللہ خان اپنی بیٹی زیبو کو ڈاکٹر خلیل کو دکھانے شہر لے جانے والا تھا۔

صوبہ سرحد کے پشتون مختلف قبیلوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ یہ قبیلے ایک دوسرے سے چند امتیازی خصائل کی بناپر مختلف ہیں، اور انہی مخصوص امتیازات سے ان کی پہچان ہوتی ہے۔ ان تمام قبائل کی مشترکہ زبان پشتو ہے لیکن ہر ضلع اور قبیلے کی پشتو میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہوتا ہے جس طرح دلی اور لکھنؤ کی اردو میں فرق ہے، اردو ہی کی طرح پشتو کا لہجہ بھی مختلف قبائل کے ہاں مختلف ہے۔ ان قبائل میں غوریہ خیل ایک بہت بڑا قبیلہ ہے جس کی پھر آگے چل کر شاخیں بن گئی ہیں۔ ان میں مہمند اور خلیل دو نمایاں شاخیں ہیں۔

غوریہ خیل کی مہمند شاخ دو بڑے حصوں میں منقسم ہے ایک کو بر مہمند یا بالائی مہمند کہا جاتا ہے اور دوسرا حصہ کو زمہمند یعنی پایاں مہمند یا میدانی مہمند کہلاتا ہے۔ پتہ مہمند سے عظیم شاعر انسانیت رحمان بابا کا تعلق تھا جو ایک صوفی بزرگ شاعر گزرے ہیں اور تمام پشتون قوم ان پر فخر کرتی ہے۔

غوریہ خیل پشتونوں کی ایک شاخ خلیل ضلع پشاور میں دریائے باڑہ کے دائیں جانب آباد ہے اور پتہ خلیل کے نام سے موسوم ہے۔ یہ پتہ بیس پچیس میل لمبا اور اسی طرح دس بارہ میل کے قریب

چوڑا ہوگا۔ جو دریائے کابل سے لیکر خیبر کے دامن کے ساتھ ساتھ جنوب تک پتہ مہمند تک چلا گیا ہے۔ اور اسی پتہ خلیل کے ایک چھوٹے سے گاؤں سفید ڈھیری میں عبدالقدیر نامی ایک دہقان کے ہاں بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عبدالمجید رکھا گیا۔ عبدالمجید کو پہلے پرائمری اسکول میں داخل کیا گیا اور پھر پشاور کے اسلامیہ کالجیٹ سے اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس کے بعد صوبہ سرحد کے سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کے قائم کئے ہوئے اسلامیہ کالج میں داخل ہوا۔ ابھی عبدالمجید نے میٹرک کا امتحان دیا ہی تھا۔ اور پنجاب یونیورسٹی نے ریزلٹ آوٹ کیا بھی نہیں تھا کہ اس کا باپ عبدالقدیر جو دمے کا پرانا مریض تھا اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ عبدالمجید میٹرک پاس کر کے کسی دفتر میں بابو بھرتی ہو جاتا کہ یہی محکوم اقوام کے ذہین فرزندوں کا مقدر تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

جو خواب عبدالقدیر نے دیکھا تھا، عبدالمجید کو اس کی تعبیر پوری کرنا تھی اور اُسے ڈاکٹر بننا تھا۔ چونکہ اس نے فسٹ ڈویژن لیا تھا، اس لئے داخلہ آسانی سے مل گیا اور پھر خدا نے اُسے اساتذہ بھی وہ دردمند دیئے جو ایسے ہی سپوتوں کے دل کی دھڑکن بن کر ان کو آگے اور آگے بڑھنے کی نہ صرف تلقین کرتے بلکہ اُن کی مقدور بھر مالی اعانت بھی اس طور کرتے کہ مدد کرنے والوں کے نام امداد لینے والوں کو کبھی معلوم ہی نہ ہو سکتے تھے۔

اور پھر عبدالمجید کی ماں گل چہرہ بھو بھی اتنی کم ہمت تو نہ تھی جو اپنے بچوں کو پڑھا نہ سکتی۔ چنانچہ وہ دن کو تھلے دار کلّے اور ٹوپیاں بناتی اور رات کو چرخہ کاتتی۔ عبدالمجید اور اس کے دو بھائیوں نے دن رات ایک کرکے پڑھا، مجید کو کالج سے تعلیمی قابلیت کی بنا پر وظیفہ

بھی ملتا تھا لیکن باقی کے دو بھائی میٹرک پاس کرنے کے بعد کلرک بن گئے اور اب گل چہرہ بہو کے لئے مجید کو ڈاکٹر بنانا اتنا مشکل نہ لگا۔

عبدالمجید کالج سے اچھے نمبرلے کر فارغ ہوا اور پنجاب کے کنگ ایڈورڈز میڈیکل کالج میں داخل ہوگیا ہر ماہ اُسے ضروریات زندگی اور تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے گھر سے پیسے ملنے لگے تھے۔ ایک دو برس گزارنے کے بعد مجید اس قابل ہو سکا تھا کہ اپنے اردگرد کے ماحول اور اس کی روایات سے کچھ کچھ واقفیت حاصل کرے۔ چنانچہ اس نے پارٹ ٹائم جاب کے طور پر ایک ہندو ڈاکٹر کاشی رام کی دوکان پر کمپونڈر کے طور پر کام شروع کر دیا تھا۔ چھٹی ہونے پر وہ اس ڈاکٹر کی دوکان پر جانے لگا تھا۔ ڈاکٹر کے لکھے ہوئے نسخوں کے مطابق دوا دارو مریضوں کو دیتا، انجکشن لگاتا۔ مرہم پٹی کرتا اور جو وقت میسر آتا اس میں اپنی کتابیں پڑھتا۔

اب اس کی ماں خاصی کمزور ہو چکی تھی، بھائی بھی اب جوان تھے اور ان کے گھر بسانا ماں کے فرائض میں سے ایک فرض تھا عبدالمجید نے تو یہ کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ مکمل ڈاکٹر بن کر کچھ عرصہ نوکری کر کے کمائے گا نہیں شادی نہیں کرے گا۔ چنانچہ عبدالمجید کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد گل چہرہ بہو اپنی دو بھانجیاں دونوں بیٹوں کے لئے بیاہ لائی اور اس طرح اپنے دونوں بیٹوں کو ماموں کے زیرِ سایہ ڈال دیا۔ حالانکہ بیوگی کے دنوں میں نہ ماموں کو اور نہ کسی اور رشتہ دار کو خیال آیا تھا کہ یہ چار پانچ یتیم بچے بچیاں بے سہارا ہو کر رہ گئے ہیں ان کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھا جائے۔

عبدالقدیر پرائی زمین کاشت کرتا تھا۔ فصل کے فصل اُسے ملتا بھی ہوگا تو کتنا ملتا ہوگا اس عسرت کی زندگی میں گل چہرہ نے

گاؤں کی کئی عورتوں کی طرح چند مرغیاں ایک دو بھیڑیں اور ایک دو بکریاں پال رکھی تھیں۔ قسمت اچھی تھی، بھیڑ بکریاں زیادہ تر مادین پیدا کرتی رہیں اور ان کی تعداد بڑھتی رہی پھر ان کے بچے ہوتے گئے اور چند سال میں عبدالقدیر کے ہاں ایک بھینس بھی آگئی جس کا دودھ اور مکھن گل چہرہ بیچتی تھی۔ مرغیوں کے چوزے نکلوا کر کچھ رکھتی، کچھ بیچتی، اس طرح انڈے بھی بیچا کرتی تھی۔ غلہ دانا تھوڑا بہت دھقانی میں مل جاتا تھا۔ گھر کے باقی مصارف گل چہرہ خود پورے کرتی رہی اور اس طرح اس کے بچے پلتے رہے۔ گل چہرہ کی دونوں بیٹیاں اشنالو اور گل خامیہ اپنے اپنے گھر کی ہو کر خوشحال زندگی بسر کر رہی تھیں کہ دونوں ہی ماں کا سلیقہ اور سگھڑ پن اپنے ساتھ سسرال لے گئی تھیں۔

اور جب مجید ڈاکٹر بنا تو بہن بھائیوں کی طرف سے وہ بے فکر تھا کہ اس کی ماں نے سب کو اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچا دیا تھا۔ اور اب گل چہرہ بہو ایک خوش قسمت اور نصیبوں والی ماں بنی ایک طرح سے راج کر رہی تھی۔

عبدالقدیر کے بارے میں تو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ مجید کو ڈاکٹر کیوں دیکھنا چاہتا تھا لیکن گل چہرہ بہو نے یہ خواب ضرور دیکھے تھے کہ اس کا بیٹا ڈاکٹر بن کر خوب خوب کمائے گا اور پھر وہ جائدادوں اور کوٹھیوں والا بن جائے گا۔ لیکن مجید کے ارادے کچھ اور تھے اس نے اپنے دمہ زدہ باپ کو دیکھا تھا جس کے پاس پیسے نہیں تھے کہ وہ اپنا صحیح علاج کروا سکتا۔ اسی طرح اپنے اردگرد کے دیہات کے ہزاروں لوگوں کو دیکھتا تھا اور محسوس کیا تھا کہ ان کے پاس بھی علاج معالجے کے لئے پیسے نہیں ہوتے

تو اِن کی بیماریاں پیچیدگی اختیار کرلیتی ہیں اور وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دوسرے جہاں سدھار جاتے ہیں۔

ایک تو معاشی لحاظ سے دیہاتی آبادی اتنی مجبور ہوتی ہے کہ جو خالص خوراک وہ پیدا کرتے ہیں خود کھانے کی بجائے شہروں میں جاکر بیچ آتے ہیں کہ اِن کو شادی غمی اور دوسری ضروریات پوری کرنے کے لیے پیسہ درکار ہوتا ہے۔ دوسرے وہ اپنے خاندانی جھنجھٹوں میں اتنے الجھے ہوتے ہیں۔ اور اِن کے ذہن دن رات تفکرات اور اُدھیڑ بن کی ایسی آماجگاہ بنے ہوتے ہیں کہ الاماں۔ آج ایک ترلبور نے اُٹھ کر دوسرے ترلبور کو گالی کا نشانہ بنایا، تو کل تو دوسرا ترلبور یہ منصوبے بنارہا ہے کہ قاتل سے بدلہ خود لیا جائے یا اگر صاحب حیثیت ہے تو اجرتی قاتلوں کے ذریعے اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کرے۔ اِس کے علاوہ اجتماعی اور انفرادی اور ہزاروں قسم کے خود ساختہ مسائل بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بھولے بھالے دیہاتیوں کی زندگیاں ایک طرح سے جہنم بنی ہوتی ہیں۔

کچھ تو یہ خاندانی اسباب ہوتے ہیں اور کچھ معاشی تنگ دستی کی بنا پر اکثر دیہاتی اب سے بہت پہلے سے آہستہ آہستہ شہروں کا رُخ کرنے لگے تھے اور ایک روز عبدالمجید کے دونوں بھائی اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر چھاؤنی میں ہی سرونٹس کوارٹر نمبر ۳ میں اُٹھ آئے تھے۔ وہ دونوں پشاور چھاونی میں کلرک تھے، اِن کا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ کسی کے ساتھ خاندانی دشمنی چلی آرہی تھی یا محنت مزدوری کے لیے گاؤں چھوڑنے پہ مجبور تھے، بلکہ اُن کا مسئلہ آمدو رفت کا تھا۔

وہ روز گاؤں سے سائیکلوں پر سوار چھاؤنی جاتے
اور سائیکلوں ہی پر ضروریاتِ زندگی شہر سے خرید کر گھروں کو لے
آتے تا بہ کے ۔؟ آخر تنگ آکر دونوں بھائیوں نے گاؤں
چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اِس وقت گاؤں میں مکان اور گھر کرائے
پر اُٹھائے رکھنے کا رواج قطعاً نہیں تھا اِس لیئے اِسی گاؤں کے
ایک اور بے گھر آدمی سرفراز کو انہوں نے اپنا گھر مفت رہائش کے
لیئے دیدیا۔

صوبہ سرحد کے دیہات میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ
جس کے پاس ایک سے زیادہ مکان ہوں یا جو کسی وجہ سے
اپنا رہائشی مکان چھوڑ کر کہیں جا رہا ہو، تو ایسے ہی کسی حاجت مند
کو گھر عارضی طور پر رہنے کے لیئے دیدیا جاتا ہے۔ ایسے مکین
کو ہمسایہ یا فقیر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ سرفراز عبدالمجید وغیرہ کا ہمسایہ
ٹھہرا۔ اور یہ سب کچھ تبھی ہوا کہ جب گل چہرہ بہو پر فالج کا حملہ ہوا
تھا اور وہ چند روز بے ہوش رہنے کے بعد ابدی نیند سو چکی تھی۔

حالانکہ وہ بہوؤں والی تھی لیکن چونکہ محنتی اور جفاکش
عورت تھی اِس لیئے آدھی رات تک خود کام میں جُتی رہتی تھی۔
اور ڈھور ڈنگر کا خیال بھی خود ہی رکھتی تھی۔ گائیں بھینسوں کو صبح کی
اذان سے پہلے ہی چارہ ونڈہ وغیرہ ڈالنا ہوتا تھا ورنہ وہ دودھ
نہیں دیتیں، گل چہرہ بہو آدھی رات کو اُٹھ کر گاؤں کی ندی سے پانی
بھرنے جاتی تھی، جب اِس پر فالج کا دورہ پڑا تو گاؤں والوں نے سمجھ
لیا تھا کہ اُسے کسی بلا نے مارا ہے۔ جس سے وہ بے سُدھ ہو گئی
تھی۔ اور ثبوت کے طور پر اِس کی کمر اور شانوں پر نشان بھی انہیں نظر
آگئے تھے۔ لیکن جب مجید نے دیکھا تو کہا کہ ماں پر فالج کا دورہ پڑا تھا

اور وہ پہلے ہی دورے میں موت کا شکار ہوگئی۔

جو کچھ بھی تھا گل چہرہ بہو کا انتقال ہوگیا تھا اب صغیر اور احمد دونوں گاؤں چھوڑ چکے تھے اور مجید سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر تھا اور ابھی اس نے شادی نہیں کی تھی کہ اُسے آگے بڑھنا تھا اور آخر خدا نے اس کی یہ آرزو بھی پوری کر دی۔ اور وہ ولایت چلا گیا۔

یہ وہ پُر آشوب دور تھا جب پورے برصغیر میں آزادی کے پروانے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کر رہے تھے اور سامراجی طاقتیں قوت کے زعم میں ان پروانوں کے پر کاٹنے میں مصروف تھیں۔ کچھ پر باقاعدہ لاقانونیت کی قینچیاں چلائی جاتی تھیں اور ان کو پر کٹا کیا جاتا تھا اور کچھ کے پر قطع برید کے بہانے پرواز سے محروم کر دیئے جاتے تھے اور جو لوگ ذرا سی سوجھ بوجھ کے مالک ہوتے تھے ان کو طمع و حرص کے دام میں پھانسنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چنانچہ عبدالمجید کو جو کہ بظاہر ایک بے ضرر سا عام آدمی تھا۔ اِسے طمع کے تحت ولایت بھیجا گیا کہ اس کی آنکھیں حکومت وقت کے جلال وحشم سے چکا چوند ہوں اور اس کے گلے میں کسی سفید چمڑی کی میمنی کی باہیں حمائل کر دی جائیں تاکہ وہ اگر وطن پرستی کا ذرا برابر جذبہ بھی دل میں رکھتا ہو تو وہ سرد ہو کر رہ جائے۔

ولایت کے زمانہ طالب علمی میں اس کو سیر و سیاحت کے مواقع بھی میسر کر دیئے گئے تھے، لیکن وہ جس طرح گیا تھا اسی طرح اکیلا واپس آیا۔ وطن آنے پر اُسے معلوم ہوا کہ اس کے بھائی صغیر اور احمد دونوں حکومت وقت کے ملازم ہو کر بھی غیر ملکی سامراجی قوت کے خلاف ہونے والے جلسے جلوسوں میں شرکت کرتے رہے۔ چنانچہ ان کو نہ صرف ملازمت سے نکال دیا

گیا بلکہ ساتھ ہی جیلوں میں بھی ڈال دیا گیا۔ انکوائری کے بعد یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ان دونوں کی سیاسی سرگرمیوں سے ان کے بڑے بھائی عبدالمجید کا دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ورنہ شاید اس سے بھی تمام مراعات اور ڈاکٹری کی اسناد تک چھین لی جاتیں پھر بھی یہ احتیاط برتی گئی کہ اس کو کلکتہ کے سرکاری ہسپتال میں ملازمت دیدی گئی اور اس طرح عارضی دیوار کھینچ دی گئی۔ حالانکہ اسی کلکتہ سے شیر شاہ سوری والی جرنیلی سڑک طورخم تک گئی ہوئی ہے لیکن غیر اقوام جب چاہتی تھیں اپنوں کے درمیان اس قسم کی دوریاں پیدا کر دیتی تھیں

آزادی کی خاطر اکا دکا واردات اب باقاعدہ کاروائیوں میں تبدیل ہو چکی تھی، بدیسیوں کے خلاف دلوں میں نفرت کے ناسور اب پھٹ کر رسنے لگے تھے لاقانونیت کا دور دورہ تھا، انگریزوں کے پیر برصغیر کی سرزمین سے اکھڑنے لگے تھے۔ حکومت وقت کا سانس پھول چکا تھا، وہ دلی، بمبئی، مدراس اور بنگال وغیرہ میں پاؤں جماتے کہ پنجاب اور سندھ حکومت کی رسی کٹتے۔ اِدھر صوبہ سرحد میں بھی جیالے مجاہدین اب کھل کر میدان میں آ چکے تھے۔

ایمل خان، دریا خان، چمنی خان، عجب خان وغیرہ کی بربریت اور دہشتیانہ سرگرمیوں کی جھوٹی داستانوں سے اب پردے اُٹھ رہے تھے۔ جنہوں نے مغل اور پھر انگریزی طاقتوں کا انفرادی اور اجتماعی طور پر مقابلہ کیا تھا۔ اب انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کئی اور عجب خان، چمنی خان دریا خان، ایمل خان وغیرہ جنم لے چکے تھے جو جیلوں میں تھے وہ بھی اور جو باہر تھے وہ بھی آزادی کی شمع پر سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔

جو بچ رہے تھے انہوں نے علاقہ غیر کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور وہیں سے وقت بے وقت حکومت انگلیشیہ کے خلاف کاروائیوں میں مصروف تھے۔ چنانچہ احمد کو تو پھانسی دیدی گئی تھی کہ اس نے جیل ہی میں ایک انگریز سپاہی کو گلا گھونٹ کر ختم کیا تھا۔ اور صغیر جیل سے کسی طرح فرار ہو کر اپنی ہی زمین پر جلاوطنی کے دن کاٹ رہا تھا اور جنگ آزادی میں مصروف تھے۔

یہ جنگ کوئی باقاعدہ لڑائی نہیں تھی، بس جس کا جو بس چلتا اپنے طور پر انگریز حکومت اور اس کے اہلکاروں کے خلاف روا رکھتا۔ کبھی ان کا مال متاع چھین، کبھی ان کو جانی نقصان پہنچا کر تنگ کرتا۔ انگریز جب ایسے لوگوں کا کچھ بگاڑ نہ سکتے تو ان کے اہل و عیال کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ اور اس طرح اس غیر سیاسی خاندان کو جو اپنے ملک میں اپنا راج دیکھنا چاہتے تھے، جو صاحب لوگوں کے بنگلوں کے ساتھ بنائے گئے چھوٹے چھوٹے اصطبل نما سرونٹس کوارٹر کی جانوروں جیسی زندگیوں سے تنگ آچکے تھے، جو سکھ کا سانس لینا چاہتے تھے جو اپنے اوپر خود حکومت کرنا چاہتے تھے اس چاہت کے کارن ان کو یہ اذیت ناک صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی تھیں اور مجبوراً احمد کی بیوہ اور ایک بچی اور صغیر کی بیوی اور دو بچے قبائلی علاقے کو ہجرت کر گئے، ان کے ساتھ اور لوگ بھی آزاد قبائل اور افغانستان کے مختلف علاقوں کی طرف کوچ کر گئے تھے یہاں سے بعد میں کئی لوگ واپس آگئے لیکن صغیر ملک کے آزاد ہونے کے بعد بھی وہیں کا ہو رہا اور مجید کو کبھی کبھار ان کی خیر خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی۔

جب اس خاندان پر یہ افتاد پڑی تھی، ان دنوں مجید

ولایت میں تھا، اس کے کانوں میں بھائیوں کی آزادی کی خاطر کی جانے والی کارروائیوں بھنک پڑ چکی تھی۔ اور وہ خوش ہوا تھا۔ اور خوش کیوں نہ ہوتا کہ وہ بھی اپنے آپ کو آزادی کے پروانوں میں سے ایک پروانہ سمجھ رہا تھا۔ لیکن اس کا طریقہ کار مختلف تھا، اس نے سر سید احمد خان اور سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کے جلائے ہوئے چراغوں سے روشنی حاصل کرنے کی ٹھانی تھی۔ وہ شمع آزادی کو مزید فروزاں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس دیئے کو جلنے کے لئے نہیں بلکہ جلائے رکھنے کو تیل فراہم کر رہا تھا۔ اور اسی طرح وہ دن رات ایک کرکے ڈاکٹر بن چکا تھا۔ جب وہ کلکتہ میں تھا تو عملی طور پر بھی جہاد آزادی میں حصہ اس طرح لے چکا تھا، کہ جو جو زخمی طبی مرکز میں پہنچا دیئے جاتے تھے ان کا علاج اور مرہم پٹی کیا کرتا تھا اور جو نہیں پہنچ پاتے تھے ان تک خود پہنچنے کی کوشش کرتا تھا کہ اسے جہاد آزادی میں حصہ لینا تھا۔ لیکن اس کا لڑنے کا طریقہ جدا تھا۔

جب ملک آزاد ہوا تو مسلمانوں کے لٹے پٹے قافلے سرحد پار کرکے پاکستان آنے لگے تو عبدالمجید نے اپنی تعیناتی سرحد پر کروائی وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتا۔ مریضوں اور ضعیفوں کو دوا دارو دیتا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتا رہتا۔ ان کی ہمت بڑھاتا کہ یہ سارے دکھ انہوں نے آزادی کی خاطر سہے ہیں۔

اور اسی طرح قافلوں کے ساتھ پشاور کے کچھ خاندان جو بمبئی میں روزگار کی خاطر بس گئے تھے۔ سرحد کے اس پار آ گئے، انہوں نے پاکستان میں ہی بسنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ چنانچہ ان مہاجرین کی ملاقات سیٹھ صولت خان کی بیٹی ثمّا سے ہو گئی۔ ثمّا کوئی حسین دوشیزہ نہ تھی لیکن عبدالمجید کو اس کا نام بہت ہی رومانی سا لگا تھا اور اس عملی اور حقیقت پسند شخص کے سینے میں سالوں پرانے مسائل نے دوبارہ جنم لے لیا بات یہ تھی کہ جب عبدالمجید اسلامیہ کالج پشاور کا طالب علم تھا تو وہ شاعری بھی کیا کرتا تھا، اس نے اپنے لئے سائل تخلص پسند کیا تھا۔ اس کے کئی جگری اور بے تکلف دوست اس کا اپنا نام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ اُسے صرف سائل کہہ کر پکارتے تھے۔ اور عبدالمجید بھی اپنے آپ کو مجید سائل لکھوانا اور کہلوانا پسند کرتا تھا۔ وہ جب بھی کسی دوست

کو خط لکھتا تو مجید سائل ہی لکھتا یا پھر صرف سائل۔ اور اس طرح اس کے شعری ذوق کی تسکین ملتی تھی۔ وہ ادب نوازی کے اسی شوق کی بدولت اسلامیہ کالج کی یونین کا ایک سرگرم رکن بھی تھا۔ یہ یونین طلبا میں آپس میں مل بیٹھنے کا ایک ذریعہ تھی، جس کی وجہ سے ان میں مجلسی احساس قوتِ تحریر و تقریر اور سیاسی شعور پیدا کرنے کا موقع ملتا تھا۔ سائل کی پشتو، اردو اور انگریزی نظمیں کالج کے ادبی مجلے میں چھپا کرتی تھیں اور اس کی شاعری میں ھما کا ذکر اکثر دیکھنے میں آتا تھا۔

لیکن جب اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور کالج کے کئی دوستوں سے جدا ہوا تو وہ پھر سے صرف عبدالمجید بن گیا اور پاکستان کے کئی شہروں میں ملازمت کرتا رہا جن میں لاہور کے علاوہ کراچی بھی شامل ہے۔

اور جب خدا نے اُسے جاوید خلیل کر دیا، تو اُس نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور واپس اپنے شہر پشاور چلا آیا۔ اور یہیں پر اپنا ذاتی کلینک کھولا۔ اب وہ ایک ماہر ڈاکٹر تھا۔ جو دوا دارو کے ساتھ ساتھ ذہنی علاج بھی کرتا تھا اور یہی وہ ڈاکٹر تھا جس کا ذکر عنایت اللہ خان، پشاور شہر کے دوست محمد رشید اعوان نے کیا تھا، اور جس کے پاس وہ زیبو کو لایا تھا۔

جب ٹانگہ گاؤں سے نکل کر باہر کی سڑک پر آیا، تو عنایت خان نے ٹانگہ رکوا کر اس کے ارد گرد لپٹی ہوئی چادر خود ہی کھول کر اتار لی۔

گاؤں میں اکثر خاندانوں کی بہو بیٹیاں اب بھی جب کسی نہایت ہی ضرورت کے پیشِ نظر گھروں سے کہیں دور ٹانگے میں جاتی ہیں تو ٹانگے کے گرد ایک بڑی سی چادر یا کئی چادریں لپیٹ لی جاتی ہیں۔ کوچوان پائیدان پر کھڑا رہتا ہے۔ سامنے کی سیٹ پر گھر کی ایک ملازمہ اور گھر کا کوئی ایک فرد سوار ہوتے ہیں۔ چادروں کے بناتے گئے

ڈولی نما خیمے میں پیچھے ان خاندانوں کی عورتیں، پندرہ بیس گز سفید لٹھے یا سفید ریشمی کپڑے کے بنے ہوئے برقعوں میں لپٹی لپٹائی بیٹھی ہوتی ہیں اور سانس تک آہستہ سے لیتی ہیں کہ راستے کے نامحرموں کو ان کے ہونے کا پتہ نہ لگے۔ پہلے تو یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر کسی خاتون خانہ یا بہو بیٹی کے دانت کا درد اتنی شدت اختیار کر لیتا کہ گھریلو ٹونے ٹوٹکے بیکار ثابت ہوتے اور ڈاکٹر، جراح یا نائی سے دانت نکلوائے بغیر چارۂ کار نہ رہتا تو اس عورت کا تمام چہرہ گھر کا ایک ذمہ دار فرد ڈھانپ لیتا تھا اور عورت صرف منہ کھول کر دانت دکھلاتی یا نکلواتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ایسا بہت کم کم نظر آتا ہے۔

لیکن عنایت اللہ خان ان باتوں کا قطعی قائل نہیں تھا جب تک زیبو شہر کے اسکول میں پڑھنے آتی رہی، اسی طرح کے چادر لپٹے ٹانگے میں آتی جاتی تھی۔ ساتھ گھر کی ملازمہ بلبل بہو اور افروزہ ہوتی تھیں۔ لیکن اب جبکہ عنایت اللہ خان ساتھ تھے تو گاؤں کی حدود تک تو پردے کی یہ عجیب قیود قائم رہیں اور اب جبکہ شہر کا علاقہ قریب آچکا تھا تو عنایت اللہ کو یہ تماشہ کم از کم شہر کے لوگوں کو دکھانا بالکل گوارا نہ تھا۔ اور اب زیبو اور افروزہ صرف برقعہ اوڑھے اور منہ ڈھانپے ٹانگے میں بیٹھی تھیں جس کے چاروں طرف کوئی چادر نہ تھی۔

باڑہ کے پھاٹک کو جب ان لوگوں نے پار کیا تو اک چھوٹی سی سڑک پر ٹانگہ موڑ دیا گیا کہ رشید نے راستے کا یہی پتہ بتایا تھا۔ سڑک کے خاتمے پر ایک گلی میں نظر پڑی اور ساتھ ہی ایک بڑا سا بورڈ دکھائی دیا۔ جس پر جلی حروف میں ڈاکٹر خلیل لکھا ہوا تھا۔ سب سے پہلے افروزہ کی نظر بورڈ پر پڑی۔

"وہ رہی خان بابا ڈاکٹر خلیل کی دوکان!"

"دوکان مت کہو اسے کلینک کہتے ہیں۔"
نہ بو نے آہستہ سے افروزہ کی غلطی کی تصحیح کی۔ افروزہ بالکل شرمندہ نہ ہوئی، کیونکہ وہ نہ بو کی شاگرد تھی۔ اور اس سے کئی چیزیں سیکھ رہی تھی۔
"تم لوگ ٹانگے ہی میں بیٹھی رہو میں ذرا پتہ کر کے آتا ہوں ڈاکٹر خلیل کلینک میں موجود ہے بھی یا نہیں۔ کیونکہ ابھی تو نے آٹھ ہی بج رہے ہیں اور دھوپ بھی ابھی ٹھیک سے نہیں نکلی ہے۔"
عنایت اللہ نے تانگے سے اترتے ہوئے کہا۔ وہ کلینک کی طرف چلا گیا اور جلد ہی واپس آ گیا اور دونوں کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ "جانے کیسا ڈاکٹر ہوگا، مریض تو ہیں مگر بہت کم ایسی جگہوں میں تو بہی غیر معروف معمولی ڈاکٹر ہی بیٹھا کرتے ہیں۔ چلو اسے بھی آزما لیتے ہیں۔"
عنایت اللہ نے کوچوان کو تانگہ ایک طرف کو کھڑا کرنے کو کہا اور خود نہ بو اور افروزہ کے آگے آگے کلینک کی طرف چل پڑا۔ چک اٹھائی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر تینوں واپس نکل آئے اور ساتھ ہی ایک اور چک لگے کمرے کی طرف گئے۔ تب تک پہلے والے کمرے سے سفید کوٹ پہنے ایک آدمی نکلا۔
"غالباً یہی ڈاکٹر خلیل ہوگا" عنایت اللہ خان نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔
"نہیں کاکا میں تو کمپونڈر ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اندر مریضوں کے معائنے میں مصروف ہیں، آپ شاید پہلی بار آئے ہیں۔ بہر حال میں آپ کو نمبر دیتا ہوں۔ انشا اللہ گھنٹہ ڈیڑھ میں آپ کا نمبر بھی آ جائیگا۔"
یہ کہتے ہوئے کمپونڈر نے عنایت اللہ کے ہاتھ میں ایک چھلا پکڑا دیا جس پر چھ کا ہندسہ لکھا تھا۔
"آپ لوگوں کا چھٹا نمبر ہوگا۔ کیا تینوں مریض ہیں، کوئی

بات نہیں ہے میں اور نمبر بھی لے آتا ہوں آپ لوگ اکٹھے ہی فارغ کر دیئے جائیں گے۔"

کمپونڈر مڑنے ہی والا تھا کہ عنایت اللہ نے کہا "نہیں بیٹے مریضہ ایک ہی ہے۔ میں اس کا باپ ہوں اور یہ ساتھ اس کی سہیلی ہے۔"

"اچھا کاکا۔ آپ مردانہ میں انتظار کریں۔ اور ان بہنوں کو اس زنانہ کمرے میں بٹھا دیں۔ اپنی باری پر ان کو بلا لیا جائیگا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

زیبو اور افروزہ اندر کمرے میں گئیں تو صرف دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں ہی خاصی تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل لگ رہی تھیں ان کی باتوں میں انگریزی کا استعمال اس تیزی سے ہو رہا تھا کہ زیبو کو پشتو اور انگریزی زبان دو جڑواں بہنیں لگیں۔ پہلے تو وہ ان کو زیادہ سمجھ نہیں سکتی تھی لیکن بعد میں وہ ان دونوں کی باتوں کو تھوڑا بہت سمجھنے لگی تھی اور پھر ان کے پورے مکالمے اس کی سمجھ میں آنے لگے تھے۔ وہ دونوں آپس میں ڈاکٹر خلیل کے طریقہ کار اور مریض سے ہمدردانہ رویے کی باتیں کر رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مختلف ڈاکٹروں سے اپنے اپنے علاج معالجے پر بھی بے تکلف تبادلہ خیال میں مصروف تھیں۔ چند منٹ اور گزرنے کے بعد ان خواتین میں سے ایک کا نمبر آگیا۔ اور جب وہ اندر گئی تو دوسری خاتون زیبو کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تم کیا بیمار ہو؟"

زیبو جھینپ سی گئی۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ اور ابھی جواب دینے کے لئے الفاظ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ خاتون نے ایک اور سوال جڑ دیا۔

"شادی شدہ ہو؟"

"نہیں اس کی منگنی ہوچکی ہے۔"

زیبو کی جگہ افروزہ نے جواب دیا۔ زیبو جزبز ہوکر رہ گئی۔

"کس سے ہوئی ہے منگنی، اپنوں میں یا پرائیوں میں؟"

"ماموں کے بیٹے سے ہوئی ہے اور اب آپ یہ پوچھیں گی کہ پڑھا لکھا ہے کہ جاہل تو ہے تو پڑھا لکھا لیکن زیبو بی بی کے مقابلے میں بالکل جاہل ہے۔"

افروزہ نے برجستہ بلاکسی جھجک کے کہا اور زیبو نے غضبناک نظروں سے اُسے گھورا۔ اور قبل اس کے کہ وہ خاتون اور سوالات کرتی اس نے بے تکان بتانا شروع کر دیا۔

"اس کا منگیتر کام دام کچھ نہیں کرتا، بس حجرے میں بیٹھا خالی کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ خان بابا کا اصرار ہے کہ وہ بی اے کرے گا تو زیبو بی بی کی شادی اس سے ہوگی ورنہ............"

ابھی افروزہ نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ وہ پہلی والی خاتون برآمد ہوئی۔ تینوں اس طرف متوجہ ہوگئیں۔ چند سیکنڈ کھڑے رہ کر اس نے اپنا دوپٹہ درست کیا اور دوسری خاتون کو سرسری سا سلام کرکے چلی گئی افروزہ کے لئے یہ بات زیادہ حیران کن نہیں تھی کہ وہ عورت برقعہ یا چادر کے صرف برائے نام دوپٹے میں یونہی باہر نکل گئی بلکہ اُسے حیرانی اس بات سے ہوئی تھی کہ ان دونوں کا آپس کوئی بھی رشتہ نہیں تھا اور پھر بھی اس بے تکلفی سے جھک رہی تھیں۔ پھر وہ دوسری عورت بھی ڈاکٹر کے بلوانے پر اندر چلی گئی۔ تقریباً تیس پینتیس منٹ کے بعد وہ بھی باہر نکل آئی اور سلام دعا کے بغیر ہی چل پڑی۔ افروزہ اور زیبو دونوں نے اس کو سلام کہا، جس کا اس نے یونہی سا جواب دیا اور اب یہ دونوں اس انتظار

میں اکیلی رہ گئیں ۔ اب دس سے اوپر بج رہے تھے عنایت اللہ خان ایک دوبار پوچھ بھی گئے تھے ۔ لیکن واپس جانا اس لئے بھی مناسب معلوم نہیں دے رہا تھا کہ ایک تو وہ فیس ادا کر چکے تھے اور دوسرے عنایت اللہ مردانہ انتظار گاہ میں موجود مریضوں کی گفتگو سے یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ انشاءاللہ آپ کے زیبو کا مسیحا یہی ڈاکٹر ہوگا ۔ آخر تو وہ باپ تھا اور پھر پڑھا لکھا باپ وہ زیبو کی بے نام بیماری سے کافی حد تک واقف تھا اُسے معلوم تھا کہ زیبو ایک نفسیاتی مریضہ کا روپ دھار چکی ہے ابتک وہ صرف جسمانی تکالیف کا شکار تھی کل کلاں کو اس کا ذہن بھی متاثر ہو سکتا تھا اور یہ سوچ کر اس نے سکھ کا سانس لیا اور یہ انتظار کی گھڑیاں اس کے لئے سوہان روح تو تھیں لیکن امید کی شمع کی لو بھی اُسے نظر آرہی تھی ۔

اس اثنا میں کمپونڈر بار بار عنایت صاحب کو تسلیاں دے رہا تھا اور عنایت اس کی چاپلوسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس نے دل ہی دل میں کہا ۔

" اب تو فیس وصول کی ہے ، تب یہ سلوک کر رہے ہو ، جب ایک مجبور مریض سرکاری ہسپتال آئے تو تم لوگ پھر ایسا سلوک کر دکھاتا اس وقت تو مریض بیچارے کی تکلیف پہ کان نہیں دھرتے ! "

جب زیبو اپنی باری پہ ڈاکٹر خلیل کے روبرو ہوئی تو پہلی ہی نظر میں ڈاکٹر نے مریضہ کی ذہانت کا اندازہ لگا لیا ۔ وہ اس طرح کہ زیبو نے اندر آتے ہی بڑے ادب سے سلام کیا ۔ ڈاکٹر نے اُسے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا ، اور افروزہ کو کمرے کی دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا دونوں نے شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گئیں ۔ جتنی دیر میں ڈاکٹر زیبو کا بہ نظر غائر جائزہ لے رہا تھا ، زیبو نے پورے

کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔

ڈاکٹر کا کلینک اندر باہر دونوں طرف سے صاف ستھرا تھا۔ مریضوں کے معائنے کے لئے بیڈ اور میز کرسیاں بھی چمک رہی تھیں سکرین بھی نہایت اجلا اجلا تھا۔ فرش پر کوئی داغ دھبہ نہیں تھا۔ ڈاکٹری اوزار تمام بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر اب زیبو کی طرف متوجہ ہو چکا تھا چند ذاتی قسم کے سوالات پوچھے جا چکے تھے۔ جن کا زیبو نے بڑے ہی محتاط اور بنیے تلے انداز میں جواب دیا تھا۔ زیبو کی کیس ہسٹری وہ اس کی زبانی تھوڑی بہت سن چکا تھا۔ ایکسرے جو وہ ساتھ لائی تھی وہ بھی دیکھ چکا تھا۔ اسی طرح خون تھوک اور پیشاب کے ریزلٹ کا معائنہ کر چکا پرانے نسخے دیکھے جس جس ڈاکٹر سے علاج کرایا گیا تھا ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور جب اس کا پورا طبی معائنہ ہو چکا تو ڈاکٹر نے اچانک سوال داغ دیا۔

"آگے پڑھنا چاہو گی؟"

"کیوں نہیں۔ میں تو چاہتی یہی ہوں۔"

زیبو نے رسان سے جواب دیا۔

"پھر ایسا کرتے ہیں کہ ...."

ڈاکٹر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ زیبو اور افروزہ دونوں نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

"کیا کرنا ہے ڈاکٹر صاحب!"

افروزہ نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے زیبو بیٹی؟"

ڈاکٹر نے زیبو سے پوچھا

"جی۔ ماں باپ زیبو ہی بلاتے ہیں۔"

زیبو کا جواب تھا۔

"آدھے گھنٹے سے زیادہ عرصہ سے میں بھی تو اسی نام سے تمہیں بلا رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے تمہارا اصل نام کیا ہے؟"

ڈاکٹر نے اب کے ہنستے ہوئے کہا۔

"میرا تو خیال ہے، اصل نام وہی ہوتا ہے جس سے ماں باپ بچّوں کو بلاتے ہیں۔ اور اگر آپ وہ نام پوچھنا چاہتے ہیں جو میرے والدین نے میرا نام پوچھنے والوں کو بتایا ہوگا تو وہ زیب النساء ہے اور اگر اسکول کے رجسٹر میں درج شدہ نام کو پوچھ رہے ہیں تو وہ زیب النساء غنایت ہے۔"

"تم نے پڑھا کہاں تک ہے؟"

"جی وہ بھی بتا چکی ہوں کہ میٹرک پاس کیا ہے۔"

"اور وہ بھی فسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے یا پھر اونچے نمبروں سے سکینڈ ڈویژن میں؟"

ڈاکٹر پھر مسکرایا بلکہ اب کے اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ بھی لگایا۔

زیبو نے کرسی میں پہلو بدلا اور اس کے چہرے پر حیرانی کے آثار نمایاں ہوئے۔

"آپ کو کیسے پتہ لگا کہ میں نے فسٹ ڈویژن لی تھی۔"

"تمہاری باتوں سے۔ تم ایک ذہین بچی ہو، زیبو بیٹی۔"

ڈاکٹر نے بے تکلفی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"جی شکر ہے۔ لیکن یہ تو ضروری نہیں ہے کہ فسٹ ڈویژن لینے والا لازماً ذہین بھی ہوگا۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے پڑھائی سے پیار تھا۔"

"تمہارے والد کا نام عنایت ہے؟"

"جی ہاں۔ عنایت اللہ خان نام ہے ان کا ہم گل آباد کے رہنے والے ہیں۔"

زیبو اور حیران ہوتی جا رہی تھی کہ یہ کیسا ڈاکٹر ہے جو کوئی نسخہ لکھنے کی بجائے، سوالات پر سوالات کئے جا رہا ہے۔

"یہ دوسری لڑکی کون ہے؟"

ڈاکٹر نے ایک دم افروزہ کی طرف اشارہ کیا اور افروزہ اندر ہی اندر لرز گئی۔ لیکن وہ بظاہر کوئی اثر نہ لیتے ہوئے زیبو کی جگہ خود ہی بول پڑی۔ "جی، میں ان کی ملازمہ ہوں یعنی خاص زیبو بی بی کی ملازمہ۔"

ڈاکٹر کی آنکھیں پھر مسکرا پڑیں۔

"شاباش بیٹی زیبو، نوکرانی بھی خاصی ذہین رکھی ہے اپنے لئے۔" "جی یہ تو میری بہن کی طرح ہے اسے گھر پر پڑھا رہی ہوں۔ لیکن اس کے والد اس کو امتحان دینے نہیں دیتے آپ کی بات درست ہے یہ اتنی ذہین ہے کہ........"

زیبو نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ ڈاکٹر نے زیبو سے کہا۔

"اچھا دیکھو زیب النساء عنایت بیٹی۔ اب تک تم مجھ سے جتنی باتیں کر چکی ہو، کیا یہ میرے پوچھنے پر اپنے والد کے سامنے دہرا سکو گی۔ اور ہاں بیچ تم جب والد کو بلاتی ہو تو کیا کہتی ہو؟"

"داجی کہہ کر بلاتی ہوں۔"

زیبو نے جواب دیا۔

"اچھا تو اپنے "داجی" کو ذرا آواز دینا۔ یہاں میرے پاس آجائیں۔"

زیبو کے اٹھنے سے پہلے ہی افروزہ اٹھ کھڑی ہوئی

اور بولی۔

"جی باہر مرد ہوں گے، زیبو بی بی کیسے جاسکتی ہے خان بابا بُرا مان جائیں گے۔ میں خود جاکر بلاتی ہوں۔"

ابھی افروزہ دوازے کی طرف چلی نہیں تھی کہ ڈاکٹر نے بتایا۔ "میں تمام مریضوں کو رخصت کر چکا ہوں۔ آخر میں تم ہی لوگ رہ گئے ہو، جاؤ بلا لاؤ خان بابا کو۔"

افروزہ نے کمرے کی چک اٹھائی اور باہر چلی گئی۔ چند منٹ بعد خان بابا بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ابھی وہ کمرے میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ ڈاکٹر نے بھرپور انداز میں زیبو سے کہا۔

"دیکھو بیٹی! داجی کے سامنے تمہیں ایک بات بھی نہیں چھپانی ہے۔ بس جو کچھ میں پوچھتا جاؤں گا، بے دھڑک جواب دیتی جاؤ گی۔"

اتنے میں افروزہ اور خان بابا کلینک میں اندر آ گئے تھے۔ عنایت اللہ خان ڈاکٹر خیبل کو دیکھ کر کچھ ٹھٹکے۔ اور پھر دوڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ ڈاکٹر بھی حیرت میں کھڑا ہو گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل چند لمحے کھڑے رہے اور پھر ایک والہانہ انداز سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ جانے کتنے لمحات گزر گئے۔ کتنے زمانوں نے پلٹا کھایا۔ سالوں پہلے بچھڑے دوست ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔

"اچھا تو عنایت اللہ خان خرچپڑ بھائی یہ تم ہو!"

اب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو چکے تھے لیکن ان کے ہاتھ میکانکی طریقے سے آپس میں پیوست تھے اور بڑے ہی پیار اور اپنائیت سے ایک دوسرے کے ہاتھ کو ہلکے اور تیز جھٹکے

دے دے کر اجنبیت کی دیوار کو ڈھا رہے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے اب قطعی اجنبی نہیں رہے تھے۔

"بھئی یہ تم ہو عبدالمجید سائل! جو کالج میں پڑھتے تھے سائنس اور کرتے تھے شاعری۔"

غنایت اللہ خان نے بھی ہنستے ہوئے پوچھ ڈالا۔

"ہاں خرّبیٹر صاحب یہ میں ہی ہوں عبدالمجید سائل۔"

"بھئی یہ سائل سے خلیل کب سے بنے ہو؟"

"یہ میرا نام نہیں میرے بیٹے کا نام ہے تمہارے بھتیجے کا نام جاوید خلیل ہے اور خلیل اس کلینک کا لیبل بن گیا اور میں ڈاکٹر خلیل مشہور ہوا۔ ویسے بھی پتہ خلیل سے جو تعلق رکھتا ہوں۔ اچھا تم بیٹھو تو سہی ذرا باتیں کریں۔"

اتنی دیر تک زیبو اور افروزہ حیرت زدہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں تھیں۔ لیکن وہ اب بھی حقیقت کی تہہ تک پہنچ چکی تھیں اور دونوں کی باتوں سے محظوظ ہو کر مسکرا رہی تھیں۔

"ہاں کافی مدت بعد ملے ہیں۔ باتیں تو بہت کرنی تھیں، لیکن میں پھر کسی اور وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ اب بس تمہاری اس بھتیجی کو دکھانے لایا ہوں۔ اس کا ذرا غور سے معائنہ کرو، اور ایسی دوا دو کہ یہ بالکل تندرست ہو جائے۔ ہاں بیٹی زیبو!"

زیبو خاموشی سے باپ کو اور ڈاکٹر کو تک رہی تھی وہ کیا جواب دیتی۔ ذرا سا سر کو جھٹکا دیا۔ جیسے باپ کی بات کی حامی بھری ہو۔

"زیبو تم کو کب دل کی باتیں بتاتی ہے۔ اس نے تو دل کی ساری باتیں مجھ سے کہہ ڈالی ہیں۔ ہیں نا زیبو بیٹی!"

ڈاکٹر بولا اور زیبو سے دوسری کرسی پر بیٹھنے کو کہا

زیبو نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

" ہاں ڈاکٹر چچا "

اب وہ اپنی معائنے والی کرسی اور میز سے ہٹ آیا تھا اور دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ چکا تھا۔ عنایت اللہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ افروزہ بھی زیبو کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

عنایت اللہ خان نے شک بھری نظروں سے زیبو کو گھورا پھر اس نے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔

" ہاں ایسے ہی بولا کرتے ہیں، میری بہادر بچی" ڈاکٹر نے عنایت اللہ کی مشکوک نگاہوں سے محظوظ ہوتے ہوئے زیبو سے کہا۔ لیکن نظریں عنایت پر جمی ہوئی تھیں۔

" اچھا اب کہو عنایت اللہ خرطرب کیا ارادے ہیں؟" اور جیسے عنایت اللہ کسی گہری سوچ سے چونک پڑا ہو۔

" ہوں۔ ہاں۔ اب، اب بس اگر کوئی نسخہ و نسخہ لکھا ہو تو دو چلیں "

" کیوں؟" ڈاکٹر نے جھوٹی حیرت سے پوچھا عنایت اللہ خان سے کچھ بات نہیں بن پڑ رہی تھی یونہی سطحی الفاظ میں بولا۔

" میں نے کہا دیر ہو رہی ہے تمام مریض جا چکے ہیں۔ باہر مردانے میں کوئی نہیں رہا۔ زنانے میں بھی شاید کوئی دوسری مریضہ نہیں ہو گی۔ اب فارغ ہو، کچھ لکھ ہی دو کہ چلیں گاؤں کو، دیر ہو رہی ہے " یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر یونہی بیٹھا رہا۔

" میرے زنانہ مردانہ دونوں قسم کے مریضوں سے

معائنے کا بھی کمرہ ہے۔ اس کرسی پر میں بیٹھا ہوتا ہوں اور اس سامنے والی آرام کرسی پر مریض آرام سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوتا ہے دوا دارو والے مریضوں کو نسخہ لکھ دیتا ہوں یا اپنے کلینک ہی سے دوا دیتا ہوں۔ لیکن زیبو جیسے مریضوں کی بیماری کی تشخیص کرنے کے بعد پہلے اس کی وجوہ معلوم کرتا ہوں۔ اور پھر علاج تجویز کرتا ہوں۔ ہر بیماری انجکشنوں اور دوا کی محتاج نہیں ہوتی۔"

ڈاکٹر نے یہ الفاظ بڑے تحمل اور دھیرج سے کہے۔

وہ اتنی دیر میں اتنا سنجیدہ ہوگیا تھا کہ عنایت اللہ کو خان تشویش لاحق ہوئی اور پوچھا۔

"کیا زیبو ذہنی مریضہ ہے؟"

"پہلے ذہنی مریضہ تھی، اب نہیں ہے!"

"یہ کیا کہا ڈاکٹر بھائی؟ تمہارا مطلب ہے کہ"

عنایت کی بات ڈاکٹر نے درمیان سے کاٹ لی۔

یہ کہ میں اپنے تمام مریض دیکھ چکا ہوں۔ گھر جانے کا خیال ہے اور کلینک میں مزید ٹھہرنے کا اور باتیں کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ زیبو اور افروزہ عنایت اللہ خان کے ساتھ ہی کافی دیر سے اٹھ کر کھڑی تھیں۔ زیبو برقعہ ٹھیک کر چکی تھی، افروزہ نے بھی برقعہ سر پر ڈالا اور نقاب ٹھیک کرنے لگی۔ دروازے کی طرف دونوں بار بار دیکھ رہی تھیں۔

"اگر تمہارے خیال میں زیبو کو کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے تو پھر مجھے اجازت دو کہ میں اسے کسی اور ڈاکٹر کو دکھا لاؤں، اب بھی جب ہم گھر سے چلے تھے تو اس کا بخار سو سے اوپر ہی تھا۔"

یہ الفاظ عنایت نے بڑے ہی اداس لہجے میں ادا

کہئے۔ "غنایت بھائی باقی باتیں گھر پر ہوں گی۔ آؤ میرے ساتھ اب گھر چلتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے اپنا سٹھتسکوپ ہاتھ میں لے لیا، سفید کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکانے لگا تھا کہ غنایت اللہ خان نے کہا۔

"گاؤں پہنچنا ہے، دیر ہو رہی ہے۔"

"ہمارے ہاں ذرا چلے چلتے ہیں۔ میرا ٹھکانہ یہاں قریب ہی ہے۔ میں تو پیدل ہی آتا جاتا ہوں۔ لیکن زیبو بیٹی راستے کی بھیڑ میں پیدل چلنے کی غالباً عادی نہ ہوگی اس لئے گھر پر ٹیلی فون کیا تھا کہ جاوید گاڑی لے آئے۔ لیکن وہ باہر گیا ہوا ہے، ماں کو واپسی کا وقت ایک بجے بتا کر گیا ہے۔ وقت کا بڑا پابند ہے۔ اب بس آنے ہی والا ہے۔ وہی تم لوگوں کو گاؤں تک بھی پہنچا دے گا۔"

ڈاکٹر غنایت اللہ خان سے گفتگو بھی کرتا جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اِدھر اُدھر سے چیزیں بھی سمیٹ سمیٹ کر اپنی اپنی جگہ پر رکھ رہا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں سیدھے گاؤں ہی چلتے ہیں وہ بچے بھوکے ہوں گے۔"

اتنی دیر میں پہلی بار زیبو بولی اور ڈاکٹر نے ایک جھٹکے کے ساتھ زیبو کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"وہ بچے بھوکے ہوں گے؟ کون سے بچے! کس کے بچے!؟"

ابھی زیبو نے بتانے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ کمپونڈر اندر داخل ہوا، زیبو اور افروزہ ذرا سا سنبھل کر کھڑی ہو گئیں۔

"جی گاڑی آگئی،"

کمپونڈر نے آکر اطلاع دی۔

"اچھا بس آ رہے ہیں"

ڈاکٹر نے عجیب سی مردہ آواز میں جواب دیا۔ مگر اس کی نظریں ابھی تک زیبو کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔

عنایت اللہ خان سمجھ گیا تھا کہ بچوں والا معاملہ ڈاکٹر کی سمجھ سے بالا ہے۔ اب اس کی باری تھی کہ ڈاکٹر کی حیرت اور سراسیمگی سے لطف اندوز ہو، چنانچہ اس نے اسی کیفیت کے تحت کہا، لیکن "ڈاکٹر صاحب" پر زور دیا۔

"چلو" ڈاکٹر صاحب" اب جبکہ موٹر منگوا ہی چکے ہو، اور گھر خوامخواہ لے جا ہی رہے ہو تو باقی باتیں میرا خیال ہے وہیں کریں گے"۔

"ٹھیک ہے چلو"۔

ڈاکٹر نے ایسے لہجے میں کہا، لگتا تھا وہ ابھی تک "بھوکے بچوں" کے گورکھ دھندے میں پھنسا ہوا ہے۔ اس نے کمپونڈر کو مخاطب کیا۔

"شمروز کلینک بند کرو، ٹیلی فون کا بٹن گھر کی طرف موڑ دو، میں ان مہمانوں کو گھر ساتھ لے جا رہا ہوں اور جو سودا سلف میں نے لکھ کر دیا ہے وہ خرید کر گھر پہنچا دو"۔

"بہت اچھا جی"۔

شمروز نے جواب دیا اور میز کی دراز سے چابیاں نکال لیں شمروز خلیل کلینک میں کمپونڈر تھا۔ کبھی کبھار ضرورت پڑنے پر گھر کا سودا وغیرہ بھی ڈاکٹر کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ وہ پشاور شہر میں رہتا تھا اور کلینک آتی دفعہ ڈاکٹر کے گھر کے لئے گوشت خرید کر ساتھ لاتا تھا۔ کبھی کبھی جب ڈاکٹر کا موڈ ہوتا تو گائے کے پائے بھی قصاب خانے سے شمروز ہی سے منگواتا تھا۔ اور دل لگی تو اکثر شادی پیر

کے قریب کی دو کانوں سے منگوایا کرتا تھا۔ شمروز ڈاکٹر سے بہت خوش تھا، کیونکہ ماہانہ تنخواہ کے علاوہ عید بقر عید پر کپڑوں کا جوڑا اور جوتے ڈاکٹر کے ذمہ تھے اور ڈاکٹر کی بیوی بھابھی وقت بے وقت شمروز کے گھر والوں کے لئے کپڑے لتے بھجوایا کرتی تھی۔ ان کی شادی غمی میں شریک ہوتی تھی۔ غرض شمروز ان کے گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

عنایت اللہ خان، زیبو اور افروزہ کو لے کر ڈاکٹر باہر موٹر کی طرف چل پڑا اور جاتے جاتے زیبو کا سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ جب وہ باہر سڑک پر آئے تو ایک وجیہہ نوجوان نے موٹر سے اتر کر پیچھے کا ایک دروازہ کھولا اور خود آگے بڑھ کر عنایت کو سلام کر کے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر نے تعارف کرایا۔

"عنایت یہ تمہارا بھتیجا جاوید خلیل ہے جس کے نام کے ایک جزو خلیل سے میں مشہور ہوا ہوں۔ اور جاوید یہ تمہارے چچا عنایت اللہ خان خرّبڑ ہیں۔ جب تم لوگوں کو گھر پر کالج کی زندگی کے واقعات سنایا کرتا ہوں تو ان کا ذکر اکثر آیا کرتا ہے۔"

ڈاکٹر تعارف کرا رہا تھا اور عنایت اللہ نے جاوید خلیل کو گلے کے ساتھ لگا کر سینے کے ساتھ بھینچا ہوا تھا اور اس کا عورتوں کے سے انداز میں منہ سر چوم رہا تھا۔ لگتا تھا جاوید کو دیکھ کر اس کے لئے اس کا پیار اس کے انگ انگ میں سے امڈ پڑ رہا ہے۔

جب جاوید عنایت کے ساتھ مصافحے اور پیار وغیرہ سے فارغ ہوا تو ڈاکٹر نے زیبو اور افروزہ کا تعارف بھی کرا دیا۔

"یہ تمہارے اس چچا خرّبڑ صاحب کی نہایت ہی ذہین اور سمجھی ہوئی بیٹی ہے، اور یہ اس کی سہیلی افروزہ ہے۔"

جاوید نے دونوں کو سلام کیا اور تھوڑی دیر کے

لئے برقعہ کے نقاب سے ڈھکے ہوئے چہرے کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ زیبو نے نقاب سے منہ اور ناک چھپا رکھی تھی اور اس کی آنکھیں ننگی تھیں۔ جاوید نے یوں محسوس کیا جیسے گدلے گدلے سے کائی کے رنگ کے دو گہرے تالابوں میں وہ بیک وقت غوطہ زن ہو کر تیر بھی رہا ہو اور ڈوب بھی چکا ہو۔

زیبو نے بڑی احتیاط سے اس کے سلام کا جواب دیا اس کی زندگی میں پہلی بار ایک نامحرم نوجوان نے اِسے اس طرح مخاطب کیا تھا۔ افروزہ نے جاوید خلیل کی نظریں زیبو کی نظروں سے ملتی دیکھیں۔ تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی اور دونوں کے جذبات مختلف ہی کیوں نہ ہوں لیکن افروزہ نے ان لمحات میں بہت کچھ پڑھ لیا تھا اور اس نے جب زیبو کی آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ سا کیا، تو ڈاکٹر نے پوچھا۔

"کیوں زیبو بیٹی؟ افروزہ اشاروں سے کیا کہہ رہی ہے تجھ کو؟" زیبو افروزہ کا اشارہ ٹھیک سے نہیں سمجھ پائی تھی، وہ بھی حیران ہو رہی تھی۔ افروزہ گھبرا سی گئی۔

"نہیں تو خان، میں نے تو بی بی سے کچھ بھی نہیں کہا ہے"

"دیکھو بچیو! میرے اس ماتھے پر جو دو آنکھیں دیکھ رہی ہونا۔ ان میں تین ہزار پچاس نظریں ہیں۔ یہ شہد کی مکھی کی آنکھوں کی طرح ہر طرف دیکھ سکتی ہیں۔ سمجھ گئیں۔"

اور ڈاکٹر نے موٹر کا پچھلا دروازہ بند کیا جس میں سے ہو کر وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھیں۔

"میں تو خیر یہ کہہ رہی تھی کہ وہ بچے بھوکے ہوں گے، ہم کو کافی دیر گزر چکی ہے۔"

افروزہ کو اپنی غلط حرکت کا احساس ہو چکا تھا اور اس نے

ڈاکٹر کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے بات بنالی۔

"بچوں کو کابلتے یا مہرو نے دانہ ڈال دیا ہوگا۔"

عنایت نے موٹر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں یہ بچے کس کے ہیں؟"

جاوید نے سٹیرنگ پر بیٹھتے ہوئے پہلی بار ان سے مخاطب

ہوکر دریافت کیا۔

"بیٹے یہ زیبو کی چتری مرغی کے ننھے ننھے نکلے چوزوں

کا ذکر ہو رہا ہے۔ ان دونوں کو ان ہی کی فکر ہے اور تمہارے ابوجناب

ڈاکٹر صاحب کتنی ہی دیر سے ان بھوکے بچوں کے معمہ میں ایسے الجھے ہیں

کہ ہماری موجودگی تک سے بھی تھوڑی دیر کو بیگانہ ہو چکے تھے۔"

جب عنایت اللہ خان یہ باتیں کر رہا تھا تو جاوید زیبو اور

افروزہ نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر ذرا سا جھینپے اور پھر انہوں نے اس زور کا

قہقہہ لگایا کہ پوری موٹر اور اس میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ کانپ کر

رہ گئے۔ چند سیکنڈ بعد سب اپنی اپنی سمجھ کے مطابق معاملے کی تہ تک پہنچ

گئے تھے اور وہ بھی ہنسنے لگے تھے۔ لیکن اب بھی ڈاکٹر کی ہنسی کی آواز

سب سے اونچی تھی۔

"اچھا تو بھائی خرطیپڑ تم نے میری اندرونی کشمکش بھانپ

لی تھی۔ میں تو سمجھ رہا ہوں کہ یہ اعزاز مجھ ہی کو حاصل ہے کہ لوگوں کے اندر

جھانک کر ان کے دل کا حال معلوم کر لیتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے جاوید پر ایک گہری سی مسکراتی

ہوئی نظر ڈالی۔ جاوید نے گھبراہٹ میں جلدی سے موٹر سٹارٹ کر دی۔

اور پھر یہ قافلہ ڈاکٹر عبدالمجید سالک سے خلیل کلینک کے جاوید

ولا کی طرف روانہ ہوا۔

موٹر پشاور چھاؤنی کی حدود میں صدر روڈ کی طرف مڑ گئی اور پولیٹیکل ایجنٹ خیبر کے دفتر کے پاس گزرتی ہوئی مال روڈ پر آگئی اور ایک خوبصورت سی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ یہی جاوید ولا تھا۔

ڈاکٹر مجید نے شاید اپنی بیوی ہما کو عنایت اللہ خان اور زیبو وغیرہ کے بارے ٹیلی فون پر مطلع کر دیا تھا، کیونکہ جب موٹر کوٹھی میں داخل ہوئی اور باہر کے برآمدے تک پہنچی تو ہما ہونٹوں پر ایک دلکش اور پیار بھری مسکراہٹ لئے منتظر کھڑی تھی۔ اُس نے ذرا سا انتظار کیا، لیکن جاوید نے حسب عادت اتر کر دروازہ نہیں کھولا، بلکہ جان بوجھ کر اسٹیرنگ اور کار کی چابیوں کے ساتھ اپنے آپ کو الجھائے رکھا، وہ موٹر سے اتر کر اور وہ دروازہ کھول کر باپ کے سامنے مزید ننگا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک طرف سے ڈاکٹر نے اتر کر اور دوسری طرف سے ہما نے آگے بڑھ کر موٹر کے پچھلے دروازے کھولے

جب ہما نے بسم اللہ بسم اللہ کہتے ہوئے دونوں لڑکیوں کو اتارا اور پیار کیا تو ڈاکٹر نے یہاں بھی تعارفی ذمہ داری خود ہی نبھائی،

"یہ زیبو ہے عنایت بھائی کی اکلوتی بیٹی، اور یہ اس کی سہیلی افروزہ ہے۔"

ہما نے زیبو کو سینے سے لگایا اور افروزہ کے سر پر بھی ایک بار پھر ہاتھ پھیرا اور ماشاءاللہ ماشاءاللہ کہتی ہوئی ان کو اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

کوٹھی اندر سے بالکل ہلکے اور سبک اور سنجیدہ قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھی۔ دیواروں پر ہلکے رنگ کی ڈسٹمپر کی گئی تھی۔ کمرے خاصے ہوادار اور روشن تھے لگتا تھا مکینوں کو سجاوٹ اور دکھاوے سے زیادہ سادگی پسند ہے۔

سردیوں کے دن تھے ہمانے بجلی کا ہیٹر لگایا اور زیبو سے کہا۔ "زمانہ کافی ترقی کر گیا ہے، اب یہ ہیٹر وغیرہ پرانے دور کی یادگار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب تو لوگ گھروں کو سنیٹرلی ہیٹیڈ کرانے لگے ہیں۔ تمہارے چچا سے کئی بار کہا لیکن وہ مخالفت کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو برف باری والے ملکوں میں لگائے جانے چاہئیں اور دوسری یہ کہ یہ صحت کے لئے بھی مضر ہیں۔ عجیب منطقی ہیں تمہارے چچا بھی۔ خود ہی آہستہ آہستہ اندازہ لگا لوگی اور بھی کئی خصوصیات کے حامل ہیں۔"

زیبو نے ہما کے لہجے میں طنز کی کھٹاس محسوس کر لی تھی۔

"ہاں چچی جان میرا خیال ہے چچا جان ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں ہمارے ملک کے وسائل ان تکلفات کے متحمل ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ تو ہم ایک طرح سے اپنے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں بلکہ ظلم کہیئے۔"

اتنے میں ڈاکٹر، عنایت اللہ خان کو بھی اندر لے آیا تھوڑی دیر بعد جاوید بھی سنبھلتا جھجکتا اندر آ گیا۔

" موٹر گیراج میں کھڑی کر دو، یہ لوگ آج رات ہمارے ہاں ٹھہریں گے۔"

ڈاکٹر نے جاوید سے کہا۔ جاوید واپس مڑنے ہی والا

ٹھاکر عنایت اللہ خان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"نہیں جاوید بیٹے! گھر بتا کر نہیں آئے ہیں۔ تمہاری چچی فکرمند ہوں گی۔ بس بھائی سے مل لئے میرا خیال ہے چلے ہی جاتے ہیں۔"

"نہیں بھیا، یہ کیسے ہوسکتا ہے، کھانے کا وقت ہے، ایک بج چکا ہے۔"

ہما اندر کی طرف باورچی خانے کو مڑتے مڑتے ٹھہر گئی۔

"بلکہ میں تو کہتی ہوں جاوید کے ابا ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں رات یہیں رہیئے۔ کتنے عرصہ بعد تو آپ دونوں دوست ایک دوسرے سے ملے ہیں۔"

"بھابی پھر سہی۔ چلو اچھا کھانا آپ ہی لوگوں کے ساتھ کھا لیتے ہیں۔ لیکن گھر پہنچنا نہایت ضروری ہے آپ زیادہ تکلفات میں مت پڑیئے۔ بس جو تیار ہو وہ کافی ہے زیبو بھی کھانے دانے کی اتنی شوقین نہیں ہے۔"

عنایت اللہ نے گلوخلاصی کی راہ ڈھونڈ نکالی تھی۔ "ڈاکٹر کے گھر میں کھانے پینے کے تکلفات نہیں ہوا کرتے۔ ہم بالکل سادہ غذا کے عادی ہیں اور آپ کو وہی کچھ کھلانے کا ارادہ ہے جو ہم نے اپنے لئے تیار کیا ہے۔ ہاں چائے پر ذرا سا تکلف ضرور ہوگا، کیونکہ میں خود بھی شام کی چائے کے ساتھ صرف بسکٹ کھا کھا کر عاجز آ چکا ہوں۔"

ڈاکٹر نے یہ کہتے ہوئے اپنا سٹیتھسکوپ الماری میں رکھ دیا اور پھر واپس آکر مہمانوں کو اپنے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف لے گیا۔

تھوڑی دیر بعد چائے آئی۔ ساتھ بسکٹ تھے سب نے ایک ایک پیالی چائے پی لیکن زیبو نے صرف ایک بسکٹ لیا ہما نے کافی زور دیا لیکن زیبو نے چائے پینے سے انکار کیا۔

"بھیا آپ ہی کہئے۔ زیبو چائے کیوں نہیں پی رہی ہے۔" "بہن زیبو کی چند اور مختلف عادات میں سے ایک عادت یہ بھی ہے کہ یہ بے وقت چائے کسی حالت میں بھی نہیں پیتی بس ایک پیالی صبح پیتی ہے اور ایک شام کو۔"

"میں نے تو سمجھا تھا سردی ہے۔ ٹھنڈ لگ رہی ہوگی، تب ہی کھانے سے پہلے چائے بنالی اور ڈاکٹر صاحب کی عادت سے واقف ہوں کہ وہ اپنے کلینک میں کسی کو بھی چائے نہیں پلاتے۔"

"ہاں بھئی! اپنا تو یہ اصول ہے کہ کلینک میں صرف مریضوں کا معائنہ کیا جائے۔ ہر ایک کو پہلے سے وقت دیا ہوتا ہے اسی مقررہ وقت میں ان کو دیکھ کر رخصت کر دیتا ہوں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ اگر کوئی جگری دوست مل جائے تو پھر کسی چائے خانے میں لے جاکر چائے پلوا دیتا ہوں۔

لیکن پہلے اپنا کام ختم کر کے۔"

ڈاکٹر نے چائے کی پیالی ختم کرتے ہوئے کہا۔ اس پر عنایت اللہ خان نے پوچھا۔

"ہمارے ساتھ تو تم نے پہلے سے وقت مقرر نہیں کیا تھا ہم کو کیسے دیکھا۔"

"دراصل آج کی لسٹ پر مریض کچھ کم ہی تھے اور دوسری بات یہ تھی کہ شمروز نے بتا دیا تھا کہ آپ لوگ نئے ہیں اور کسی گاؤں

سے تانگے میں آئے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آپ سے ملنا جو قسمت میں لکھا تھا۔"

ڈاکٹر نے بڑے خلوص کے ساتھ زیبو کو اور پھر عنایت کو دیکھا۔"

سب کے دل اپنائیت کے جذبات سے معمور تھے اور ان کے چہروں کی شادابی بتا رہی تھی کہ وہ سب ایک دوسرے سے مل کر کس قدر خوش ہیں۔

اتنے میں گھر کا ملازم اندر آیا اور اطلاع دی۔

"جی کھانا تیار ہے۔ یہاں لاؤں یا ڈائننگ روم میں آیئے گا۔"

میرا خیال وہیں چلتے ہیں اسلم کھانا وہیں ڈائننگ روم میں ہی لگا دو۔ ٹھہرو میں بھی آتی ہوں تمہاری مدد کرنے۔

"آپ کی ضرورت نہیں ہے بی بی جی! میں ٹیبل پہلے ہی ٹھیک کر چکا ہوں۔ آپ لوگ وہاں چلیں میں ابھی کھانا حاضر کرتا ہوں۔"

ملازم نے بڑے ادب سے کہا اور خود مڑ کر تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔ ہم سب کو لے کر کھانے کے کمرے تک جب آئی تو برتن بڑے قرینے سے میز پر سجے رکھے تھے۔ سب نے باری باری ڈائننگ روم میں لگے واش بیسن میں ہاتھ دھوئے۔ ہما نے کرسیاں ٹھیک کر لیں اور سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ہما نے زیبو اور افروزہ کو میز کی ایک طرف بٹھایا، سامنے جاوید کو بیٹھنے کا کہا لیکن وہ میز کے اس سرے پر بیٹھا جہاں ایک کرسی رکھی رہتی ہے۔ ڈاکٹر اور عنایت ساتھ ساتھ دوسری طرف بیٹھ گئے۔ ہما نے بیٹھنے سے

پہلے ملازم کی مدد کی اور سب کو کھانا پیش کرنے لگی۔

" پھچی جان آپ بیٹھیے کھانا کھائیے ہم اپنی مدد آپ کریں گے۔ جب کھانا کھانے بیٹھے ہی ہیں تو تکلف چہ معنی دارد"

سب لوگ کھانا کھا کر ڈرائنگ روم میں واپس آگئے تھے۔ جاوید نے دو باتیں نوٹ کرلی تھیں ایک تو جب زیبو وغیرہ نے کھانا کھانے کے لیے ہاتھ دھوئے تھے تو ہینگر کے ساتھ لگے تولیے سے کسی نے بھی ہاتھ نہیں پونچھے تھے۔ لیکن جب کھانا کھایا گیا اور دوبارہ ہاتھ دھوئے گئے تو تولیا استعمال کرلیا گیا تھا اور دوسری بات جو زیادہ اہمیت کی حامل تھی، وہ یہ تھی کہ زیبو اس سے آنکھیں چرا رہی تھی، کیونکہ جتنی بار بھی جاوید نے کنکھیوں سے زیبو کو دیکھا وہ کھانا کھانے میں مصروف ہوتی اس کے مقابلے میں افروزہ کی آنکھیں کئی بار جاوید سے چار ہو چکی تھیں۔ لیکن یا تو وہ اس کی بیباکی کے سبب اس سے متاثر نہیں ہو رہا تھا یا پھر وہ اس کی حیثیت سے واقف ہو چکا تھا کہ وہ زیبو کی ذاتی ملازمہ تھی اور وہ آشنا گر نہیں سکتا تھا۔ بلکہ یہ بات بھی نہیں تھی پر جانے کیا بات تھی کہ جس نے جاوید کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا تھا۔ وہ زیبو کی اس لاپروائی سے مایوس بھی ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا کہ وہ اس کی نظروں سے بچ کر اپنے آپ کو قابو رکھنے کے قابل ہو سکا تھا۔

ڈاکٹر کے گھر میں شام تک خوب چہل پہل رہی، یہ دسمبر کی ایک خوشگوار شام تھی پورا دن دھوپ خوب چمکی تھی بارشیں ہوتی نہیں اس لیے فضا میں خنکی بھی زیادہ نہیں تھی۔ ہما نے کوٹھی کے لان میں دھوپ میں کرسیاں ڈلوا رکھی تھیں، سب لوگ دھوپ سینک

چکے تھے، چائے پی جا چکی تھی اور اب عنایت اللہ خان اور ان کی بیٹی زیبو اور ملازمہ افروزہ واپس جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ آخر عنایت اللہ سے صبر نہ ہو سکا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈاکٹر بھائی اور بھابی۔ بس اب ہمیں اجازت دیجیے گھر جانا ہے دیر ہو رہی ہے۔"

زیبو اور افروزہ بھی عنایت کی اس بات پر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہمایہ دیکھ کر ایک دم چونکی۔

"یہ کیا تم دونوں کیوں اُٹھیں بھلا۔ تم کو جانے ہی کون دیتا ہے کم سے کم آج رات تو دونوں ہماری مہمان رہو۔"

"نہیں بھابی مہرو بڑی وہمی ہے! مجھے کی زیبو کی طبیعت زیادہ خراب تھی اس لئے نہیں آسکی۔ پوری رات کانٹوں پر بسر کرے گی۔" "ایسی کوئی بات نہیں ہوگی! یہ آپ بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں بہر حال آپ کا جانا اگر بہت ضروری ہے تو میری طرف سے اجازت ہے لیکن زیبو میرے ساتھ رہے گی آج نہیں جاسکتی۔"

اور عنایت اللہ خان کو اکیلے ہی گاؤں جانا پڑا۔

ڈاکٹر عبد المجید سائل کی یہ کوٹھی "جاوید ولا" بڑی پُرسکون تھی اور مال روڈ کے پُر فضا ماحول نے اس میں مزید اضافہ کر رکھا تھا۔ بیت جھڑ کے باوجود کوٹھی کے اندر جگہ جگہ موسمی پھول اور سدا بہار قسم کے پودے لگے ہوئے تھے جو اپنے مکینوں کی خوش ذوقی کا مظہر تھے۔

"جاوید ولا" چار بیڈ روم پر مشتمل تھا۔ ایک بیڈ روم ان میاں بیوی کا تھا اور ایک جاوید کا۔ جاوید کے بیڈ روم سے ملحق مہمانوں کا کمرہ تھا اور ان دونوں کا غسل خانہ مشترک تھا۔ جاوید کے کمرے کی ایک کھڑکی ماں باپ کے کمرے میں کھلتی تھی جو ایک عرصہ سے

بند پڑی تھی۔ چوتھا بیڈ روم سجا سجایا رکھا تھا جو رشتہ داروں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ویسے اگر کبھی مہمان زیادہ تعداد میں ہوتے تو کمروں کے مستقل مکین ادھر ادھر شفٹ بھی ہو جایا کرتے تھے۔ بہر حال یہ صورت مہمانوں کی نوعیت پر منحصر تھی اور آج رات جو زیبو اور افرونہ اس کوٹھی میں مہمان ٹھہرائی گئیں تو ہما نے اپنا بستر رشتہ داروں والے کمرے میں لگوایا اور یہ تینوں رات گئے تک باتوں میں معروف رہیں۔ ہما کی باتوں کا مرکز زیادہ تر جاوید کا بچپن اور اس کی تعلیمی قابلیت رہی۔ وہ باتوں کے درمیان بار ہا روئی بھی کہ اس کا جاوید بالکل اکیلا ہے اور اس کا کوئی اور بہن بھائی نہ ہو سکا۔ اسی طرح وہ زیبو کے لئے بھی افسوس کرتی رہی کہ پانچ بہن بھائی پیدا ہونے کے باوجود وہ اکلوتی بیٹی کہلائی۔

ہما زیبو کی ماں کی عمر کی لگتی تھی، لیکن اپنے رکھ رکھاؤ اور شہری زندگی کی وجہ سے اسمارٹ اور جوان نظر آ رہی تھی، لیکن جب اس پر مزید بچے پیدا نہ ہونے کے خیال کی وجہ سے اداسی چھا جاتی تو وہ اپنی ظاہری عمر سے دس سال بڑی لگنے لگتی اور توجہ ذرا سی بھی دوسری طرف ہٹتی تو یہ پھر سے اپنی پرانی وضع قطع کے ساتھ ہنستی مسکراتی سمارٹ سی خاتون خانہ بن جاتی۔

زیبو نے ایک بات اور بھی محسوس کر لی تھی اور وہ یہ کہ جس طرح ڈاکٹر سائل اور اس کی بیوی ہما زندہ دلی کا ثبوت دے رہے تھے جاوید اتنا ہی کم گو محتاط اور سمٹا سمٹا یا لڑکا لگتا تھا پہلے تو اس کا خیال تھا کہ شاید ہم دونوں لڑکیوں کی موجودگی میں وہ اتنا ریزرو رہتا ہے لیکن جب ہما نے ان کو بتلایا۔

" جاوید میرا بڑا برخوردار بچہ ہے۔ آج کل کے جوانوں جیسا نہیں ہے۔ باپ اس سے زیادہ تیز ہے حالانکہ یہ جتنی

اور چالاکی جاوید کی عمر کے لڑکوں کو زیب دیتی ہے۔ تمہارے چچا اس بات کی اکثر شکایت کرتے ہیں۔ وہ جاوید کو تیز و طرار اور چست و چالاک لڑکا دیکھنا چاہتے ہیں لیکن لیکن ہر ایک کی اپنی فطرت ہوتی ہے ویسے پڑھائی میں بہت اچھا ہے ماشاءاللہ! آج تک ہر کلاس میں فسٹ آتا رہا ہے میڈیکل میں بغیر کسی سفارش کے خود ہی داخلہ مل گیا تھا۔ حرام ہو جو تمہارے چچا نے کالج میں داخل کروانے کے لئے ایک قدم بھی ساتھ دیا ہو۔ یا کسی سے کہلوانے کو ایک لفظ بھی منہ سے نکالا ہو۔ بس کالج گیا اور واپس آکر داخلے کے پیسے مانگے اور دوسرے دن سے جو جا رہا ہے تو ماشاءاللہ فائنل میں پہنچ گیا ہے اب ۔"

زیبو نے اندازہ لگالیا تھا کہ جاوید کی فطرت ہی ایسی ہے اور زیبو کو بھی اس بات سے ذرا سی حیرانی ہوئی تھی جب افروزہ نے ہولے سے کہا تھا۔

"زیبو بی بی ماں باپ دونوں کا رنگ سرخ و سفید ہے، لیکن جاوید خان کا رنگ دیکھ رہی ہو، صحت مند گندمی ہے۔"

"ہوگا! ہمیں کیا؟ ہو سکتا ہے پڑھتا زیادہ ہو۔ آخر تو میڈیکل میں ہے۔ پڑھائی بھی رنگ پر اثر انداز ہوتی ہے۔"

زیبو نے یہ کہہ کر اپنی بھی تسلی کرنے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن جاوید خان کے نقش بھی تو باپ پر ہیں اور نہ ماں پر!!"

افروزہ نے دوسری بار کہا تھا

"وہ تم ہو جو یہ باتیں نوٹ کر لیتی ہو، بس اب بند کرو یہ بحث چچی ادھر کو آرہی ہیں۔ ان کو شک ہو جائیگا تا کہ ہم کیا باتیں کر رہی ہیں۔"

اور پھر دونوں چپ ہو گئیں۔۔

"اچھا تو زیبو بیٹی! تمہارے چوزے بھوکے ہوں گے! ابھی تمہیں جانے کی اتنی جلدی تھی۔"

دوسرے دن چھٹی تھی اور اس وقت سب لوگ باہر لان میں دھوپ

میں کرسیاں ڈالے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے زیبو سے کہا اور سب لوگ ہنس پڑے۔

زیبو کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھیل گئی۔

"جی نہیں۔ یہ بات نہیں تھی۔ وہ تو مرغی خانے کی دیکھ بھال کو اور لوگ بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ ذرا نئے نئے چوزے نکلے تھے ایسے چوزوں کی اکثر میں خود ہی چند روز تک دیکھ بھال کیا کرتی ہوں۔"

"تمہارے فارم میں کل کتنی مرغیاں ہونگی۔"

ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"جی میں تو چند روز سے بیمار تھی، وثوق سے کہہ نہیں سکتی، ہاں افروزہ پوری گنتی بتا سکتی ہے۔"

یہ سنتے ہی افروزہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"جب ہم صبح گھر سے روانہ ہو رہے تھے تو چار سو اٹھائیس مرغے مرغیاں تھیں۔"

اس پر سب نے حیرت کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نے انتہائی دلچسپی سے پوچھا۔

"صحیح گنتی بتا رہی ہو؟"

"جی ہاں، ایک ایک خود گن کر آ رہی ہوں اور کاپی پر نوٹ بھی کیا تھا۔"

"تم صرف مرغیاں گنا کرتی ہو یا کوئی اور خدمت بھی سرانجام دیتی ہو؟"

اب کے جاوید نے سوال کیا۔

افروزہ کا رنگ سرخ ہو گیا، لیکن جواب دینا ضروری سمجھ رہی تھی بولی!

"زرتاج اور کلیم جگہ کی صفائی کی ذمہ دار ہیں۔ دانہ دنکا میں کھلاتی ہوں دوا دارو اور انجکشن لگانے کا کام زیبو بی بی نے خود سنبھالا ہے۔ مجھے بھی انہوں نے ٹریننگ دی ہے، جب ان کی طبیعت ناساز ہو تو یہ ڈیوٹی بھی میں ہی انجام دیتی ہوں۔"

اب ڈاکٹر کی دلچسپی حقیقی دلچسپی میں بدل چکی تھی، انہوں نے کرسی میں پہلو بدلا اور بولے۔

"یہ کونسی نسل کی مرغیاں ہیں؟"

مگر پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر اپنی بات کا جواب پاتے عنایت اللہ خاں نے ٹوکا اور بیزاری سے کہا۔

"سائل بھائی یہ دونوں تو پاگل ہیں اگر ایک بار بحث میں ان سے الجھ گئے تو کل تک کیا، ہفتوں یہ بحث ختم نہ ہوگی۔ مرغیوں کے بعد بھیڑ بکریوں کا ذکر چھڑ جائے گا۔ اس کے بعد شہد کی مکھیوں کی کہانی شروع ہو جائے گی، بس تینوں کی طرح چمٹ گئیں۔ تو جان چھڑانا تمہارے لئے محال ہوگا۔"

اس پر ہما نے کہا۔

"یوں کیوں نہیں کر لیتے زیبو کا فارم خود دیکھنے چلے جاتے ہیں گاؤں۔"

اس پر سب نے حامی بھری اور یہ بات طے ہو گئی کہ زیبو کا فارم دیکھنے گاؤں جایا جائے۔ اس طرح زیبو کی ماں مہرالنسأ سے ہما کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔ عنایت نے جاوید کو بھی گاؤں چلنے کی دعوت دی اُس پر وہ خاموش رہا، لیکن جب باپ نے بھی چلنے کو کہا تو اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔

"یقین کیجئے اعتبار نہیں آیا۔ گاؤں میں ایک لڑکی اتنا بڑا فارم چلا رہی ہے۔"

ہما نے اپنی حیرانی پر مزید حیرت کی مہر ثبت کر دی۔

"بھابی سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔ جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی تو خود ہی اعتبار آجائے گا۔

عنایت اللہ نے یہ بات کہتے ہوئے اپنی بیٹی زیبو کو بڑے فخر سے دیکھا
اس پر زیبو خوشی سے کھل اٹھی اور اس کے چہرے کا رنگ سرخی مائل ہو گیا۔
ڈاکٹر کو اس بات پر شرارت سوجھی انہوں نے کہا۔
" عنایت بھائی ہما آپ کی بات کا اعتبار کر چکی ہے، لیکن زور دینا
اس بات پر مقصود ہے کہ اب ہمارا آپ کے گاؤں جانا نہایت ضروری ہو
گیا ہے اور اسے کسی قیمت پر بھی ملتوی نہ کیا جائے اور یہ کہ بلاوا بھی
زوردار قسم کا ہو۔"

ہما اس بات پر جز بز ہو گئی اس نے ماتھے پر بل ڈال لئے اور شوہر
کو کوئی جواب دینا چاہتی ہی تھی کہ زیبو نے حالات کو سنبھالا دیا۔
" چچا جان، اب تو بلاوے کی کوئی حاجت ہی نہیں رہی۔ میں تو کہتی ہوں۔
ابھی ہمارے ساتھ چلئے! ویسے بھی آج آپ کی چھٹی ہے۔ میں نے اور
افروزہ نے آپ کے ہاں رات بھی گزار لی۔ داجی نے کل گاؤں جا کر بے بے
کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ بلکہ مجھے تو قوی امید تھی کہ بے بے داجی کے ساتھ
ہی آجائیں گی۔"

اس پر عنایت نے کہا۔
" میں نے تو بہت زور دیا کہ چلو چلتے ہیں۔ ان لوگوں سے بھی مل
لو گی اور لڑکیوں کو بھی ساتھ لے آؤ گی۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر جان چھڑائی
کہ زیبو اور افروزہ رات وہاں رہیں تم بھی ہو آئے اب ان کی باری ہے کہ
وہ یہاں آئیں۔"

" چلئے پھر چلتے ہیں۔ تیار ہو جائیں۔"
زیبو نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں برآمدے میں رکھے گئے
ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ڈاکٹر نے جاوید سے کہا۔
" جاوید دیکھو بیٹے کون ہے؟"

"کسی مریض کا ہی فون ہوگا۔ آج چھٹی کا دن ہے لیکن لوگ جان نہیں چھوڑتے۔ کتنا عجیب ہوتا ہے ڈاکٹری کا یہ پیشہ بھی۔"

ہما بڑبڑائی۔ تھوڑی دیر بعد جاوید کی آواز آئی۔ وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔

"آغا جی! مسز فضل داد ہیں۔"

"کہو گھر پر نہیں ہیں۔ آج چھٹی کا دن دیکھو اور..... " ڈاکٹر کی جگہ ہما نے کہا۔

"ڈاکٹروں کی کبھی بھی چھٹی نہیں ہوا کرتی۔"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر فون سننے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اتنی دیر میں نوکر چائے لاکر کرسیوں کے درمیان میز پر رکھ چکا تھا۔ ہما چائے بنانے لگی تو زیبو نے کہا۔

"لائیے چچی جان! چائے میں بنا لیتی ہوں۔ آپ جانے کی تیاری کیجئے۔"

"ہاں امی! چائے ان کو بنانے دیں، خود تو پیتی نہیں ہیں، اپنے حصے کی چائے بھی ہم ہی کو پلا دیں گی۔"

جاوید نے دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور پہلی بار بڑی جرأت کے ساتھ زیبو کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ ورنہ اب تک وہ نظریں آوارہ آوارہ سی ادھر ادھر پھرا رہا تھا۔

"اگر چائے اتنی پسند ہو تو میرے حصے کی بھی آپ ہی پی لیجیے۔"

افروزہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ لیکن جاوید نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنی دیر میں زیبو پیالیاں بنا کر چچی کو باپ کو اور جاوید کو پیش کر چکی تھی۔ افروزہ نے باقی ڈیوٹی خود سنبھالی اور اپنے حصے کی بنی ہوئی پیالی اٹھالی۔ چند گھونٹ لئے ہی تھے کہ ڈاکٹر کو ریسیور رکھتے اور واپس آتے دیکھا۔ اپنی پیالی میز پر رکھ دی۔ زیبو بھی میز کی طرف بڑھی۔ لیکن افروزہ اس سے پہلے ہی پہنچ گئی اور ڈاکٹر کے لئے چائے بنانے لگی۔

"توبہ ہے مسز فضل داد بھی ایک بار ریسور پکڑ لیتی ہے تو پھر چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتی جب تک کہ ایکسچینج والے کسی اور کی کال کا نہ کہہ دیں۔ نہ ٹیلیفون کان سے ہٹتا ہے اور نہ ہی زبان رکتی ہے۔"

ہما نے بڑی ہی بے زاری سے تیوری پہ ہزار بل ڈال کر کہا۔

"جاوید کی ماں تم کیا جانو اس دھرتی کے باسی کن کن عوارض کا شکار نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھے ہوئے افروزہ سے چائے کی پیالی لی، ایک دو گھونٹ لئے اور پیالی واپس رکھ دی وہ کسی گہری سوچ میں چلا گیا تھا۔

"اب تو سمجھو وہ تندرست ہو گئی ہے۔ اپنے آپ میں آ چکی ہے۔ بھلی چنگی ہے اب کاہے کو دوسرے تیسرے فون کرتی ہے۔"

ہما کے لہجے سے بیزاری اور شکایت دونوں ٹپک رہے تھے۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ مسز فضل داد ہیں کون؟ اور یہ کہ بیمار کیا تھیں؟"

عنایت اللہ نے فضا کو گدلا گدلا سا محسوس کر کے پوچھ لیا۔

"بس ایک نفسیاتی کیس سمجھو!"

ڈاکٹر کا مختصر جواب تھا۔

"ایک نفسیاتی کیس تھی!! وہ تو سمجھو نفسیات کی ایک پوری کتاب تھی۔"

ہما نے "ایک" پر زور دیتے ہوئے عنایت اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آخر کوئی تکلیف تو ہو گی نا، تب ہی تو ڈاکٹر چچا کے زیر علاج آئی ہوں گی۔"

زیبو نے بھی دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹی! تم ایک تکلیف کو کہہ رہی ہو؟ اس بے چاری کو تو کتنی ہی تکالیف تھیں۔"

"مثلاً"

عنایت اللہ نے مختصراً پوچھا۔

ڈاکٹر نے کرسی میں پہلو بدلا اور بیوی پر ایک گہری نظر ڈالی۔

"ہاں مسز فضل داد، جس کا نام رضیہ ہے۔ کانونٹ کی پڑھی ہوئی ہے انگریزی خوب فرفر بولتی ہے۔ آج کل کے تمام معاشرتی ایٹی کیٹس سے خوب واقف ہے۔ جب اس کی شادی فضل داد سے ہوئی تھی تو بہت خوش تھی کیونکہ شادی اپنی مرضی کی جگہ ہوئی تھی۔ سسرال میں عورتوں کو پڑھانے کا رواج نہ تھا اس لئے شروع میں اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی جوں جوں دن گذرتے گئے۔ رضیہ کو اس غلط احساس نے گھیرنا شروع کیا کہ وہ خاندان کی سب عورتوں سے کوئی بہت ہی اونچی چیز ہے۔ چنانچہ اس کمپلیکس نے رضیہ اور سسرال کے درمیان اجنبیت کی وہ دیوار کھڑی کر دی جس کو پھلانگنا کسی کے بس کا روگ نہ رہا اور نہ صرف رضیہ کی اپنی شخصیت اس خود ساختہ دیوار کے نیچے دب کر کچلی گئی بلکہ فضل داد اور رضیہ کے درمیان بھی حائل ہوئی اور خاتمہ طلاق پر ہوا۔"

"مسز فضل داد اب میکے میں رہتی ہیں؟"

" زیبو نے پوچھا۔

"نا میکے کیوں! ہاں جب طلاق نہیں ہوئی تھی، وہیں تھی، پھر شدید بیمار پڑی، مرتے مرتے بچی ہے تمہارے چچا کے علاج سے۔ سمجھو اب تک زیر علاج ہے اور اپنے گھر رہ رہی ہے۔"

ہما نے بڑے فخریہ انداز میں یہ جملے ادا کئے، جس پر ڈاکٹر زیر لب مُسکرایا۔

"دوسری شادی کر لی ہے کیا؟"

عنایت نے پوری دلچسپی سے پوچھا۔

"نا بھیا اب تو وہ شادی کے نام سے بدکتی ہے۔ ٹھوکر جو اتنی بڑی کھائی۔"

ہما نے جواب دیا۔

"آخر کو زندہ انسان ہے۔ ہزاروں ضروریات ہوا کرتی ہیں، کچھ تو کرتی ہوں گی۔"

زیبو نے اس بار پوچھا۔

"ہاں بیٹی، میرے مشورے سے ایک سلائی سنٹر کھول رکھا ہے غریب عورتیں اس میں کام کرتی ہیں، خوب چل رہا ہے۔"

ہما نے یہ بات بھی بڑے زعم سے کہی۔ ڈاکٹر اب کی بار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس سنٹر میں زیادہ تر ایسی عورتیں کام کرتی ہیں جو یا تو مطلقہ ہیں اور یا پھر یونہی لڑ جھگڑ کر میکے آن بیٹھی ہیں۔"

"تو اس میں ہنسی کا کونسا پہلو نظر آیا آپ کو؟ پھر مرد ہو نا، ظالموں کی حمایت کر رہے ہو ایک طرح سے۔"

ہما نے برا منایا۔

"میں حمایت کسی کی بھی نہیں کر رہا ہوں۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی ہما بیگم! شادی تو نام ہے کچھ لینے کا، کچھ دینے کا۔ اب اگر ایک شوہر بیوی کی غلط خاطر داریوں کی خاطر ان پڑھ ماں بہنوں کو چھوڑنا نہ چاہے تو بیوی کیوں اتنی جذباتی ہو جاتی ہے کہ سرے سے اپنا گھر بار ہی تباہ کر دے۔ دیکھو نا، مرد کی بھی کچھ مجبوریاں ہو سکتی ہیں۔ آخر اس کو ہی کیوں قصوروار ٹھہرایا جائے؟"

ڈاکٹر نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

"اور یہ قصور کس کا ہوا کرتا ہے کہ عورت کے اولاد نہ ہو سکے اور مرد جلدی سے دوسری شادی رچا کر پہلی کو نکال باہر کرے؟"

ہما نے بحث میں الجھتے ہوئے سوال کیا۔

"مسز فضل داد کے بچے ہیں؟"

عنایت اللہ نے دریافت کیا۔

"اگر بچے ہوتے تو آج یہ دن دیکھنا پڑتا بیچاری کو؟"

ہما نے گہرا سانس لے کر بڑے ہمدردانہ لہجے میں جواب دیا۔

"چچا جی نے تو ابھی کہا تھا کہ ان کو اپنی تعلیم پر بڑا فخر تھا اس لئے۔۔۔۔"

زیبو نے کہا۔

"تمہارے چچا تو ہر بات اپنے نظریات کے ترازو میں تولتے ہیں۔ ورنہ جدائی کی اصل وجہ یہی بے اولادی تھی۔

"علاج بھی تو ہو سکتا تھا۔"

عنایت نے اپنی رائے دی!

"عنایت بھائی! اگر سچ بولوں تو تمہاری بھاوج پھر ناراض ہوں گی۔ مسز فضل داد کو علاج کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے بچے تو ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ اپنے فگر (FIGURE) کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ ابارشن (ABORTIONS) پر ابارشنز کرواتیں رہیں۔ فضل داد سخت مخالفت کرتے رہے۔ رضیہ نے نہ مانا، اور پھر ایک وقت آیا کہ جب راضی ہوئیں تو بچوں کے قابل نہ رہی تھیں، فضل داد کو بچے چاہیئے تھے کیونکہ وہ ایک صاحب حیثیت تاجر ہے، لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ اب دیکھو دوسری عورت مزے کر رہی ہے۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں ہے۔ بیوی اپنی جگہ خوش فضل داد اپنی جگہ مطمئن کہ دو تین بچوں کا باپ بن چکا ہے۔"

"اس کا تو ایک اور علاج بھی ہو سکتا تھا اگر مسز فضل داد کی غلطی سے اتنا بڑا خلاء پیدا ہو گیا تھا تو اس کو پر بھی کیا جا سکتا تھا۔ کسی قریبی غریب رشتہ دار کے بچے کو متنبہ بنا لیا جاتا۔"

عنایت نے اپنی طرف سے صفائی میں دلیل پیش کی۔

"عنایت بھائی متنبہ حقیقی وارث نہیں بن سکتا تھا نا۔ اور اس کو ضرورت تھی ایک حقیقی وارث کی، سمجھے آپ!"

ڈاکٹر نے بھی دلیل دی۔

"اور پھر پرائی اولاد کب پیاسی ماممتا کا کلیجہ ٹھنڈا کر سکتی ہے۔ مرد کے پدری جذبات کا تو کہہ نہیں سکتی۔ لیکن عورت ہزار پرائی اولاد کو اپنے سینے سے لگا کر پالے پوسے پھر بھی اس کے سینے میں ایک پھانس سے پھنسی رہتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ ایک نامکمل عورت ہے اور تقدیر نے اس سے تخلیق کا حق چھینا ہوا ہے۔"

ہما اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے خبر ہو کر پوری گمبھیرتا سے بولے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کو ذرا سی خاموشی چھا گئی۔ لیکن ڈاکٹر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ کیا فضول بحث شروع کر دی۔ ہم مسز فضل داد کی بات کر رہے ہیں اور تم مکمل اور نامکمل کا ذکر لے بیٹھیں!"

"ویسے ڈاکٹر بھائی میں نے تو بات یہ پوچھی تھی کہ مسز فضل داد کو تکلیف کیا تھی؟"

ڈاکٹر نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"عنایت بھائی! یہ دنیا بڑے ہی عجیب عجیب امراض کا شکار ہے کئی تو ایسی بیماریاں بھی لوگوں کو لاحق ہیں جن کے اب تک نام بھی معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ بس سمجھو، جس طرح کپڑے کے کارخانے میں نئے نئے ڈیزائنوں قسموں اور رنگوں کے بے شمار کپڑے تیار ہو رہے ہیں۔ ان کے اپنے اپنے نام رکھے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر بیچاروں کو بھی نئے نئے امراض سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بیماری کی علامات کو دیکھ میٹنگیں کر لیتے ہیں۔ پھر اس نئی بیماری کا نیا نام تجویز کر لیا جاتا ہے اور اس طرح روز بروز بیماریوں کے ناموں کی لسٹ طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ نئی نئی ادویہ کی ایجاد کی رفتار بھی بڑھ رہی ہے۔"

جب بات طول پکڑ گئی تو ہما نے بیچ ہی میں ٹوک دیا۔

"چھوڑو جاوید کے ابا، تمہارے پاس تو ایسی باتوں کی پوٹلیاں بھری

پڑی ہیں۔ ان قصّوں کو کسی اور وقت پہ اٹھا رکھو۔ اب اگر جانے کا موڈ بن چکا ہو، تو چلو گاؤں چلتے ہیں۔"

"چلو جاوید بیٹے تم موٹر نکالو، تم نے تو کپڑے تبدیل کر لیتے ہیں، میں بھی ذرا تیار ہو کر آتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے یہ کہا اور کپڑے تبدیل کرنے اندر چلا گیا ہما بھی یہ کہتے ہوئے ساتھ ہی اٹھ گئی۔

"زیبو! میں بھی ذرا کپڑے تبدیل کر کے آتی ہوں۔ بس تیار رکھے ہیں اور تم لوگوں کے برقعے بھی ساتھ لے آتی ہوں۔ تم دونوں دھوپ میں بیٹھی رہو میں ابھی آئی۔ یہیں سے چلتے ہیں باقی کام نوکر سنبھال لیں گے۔ میں ان کو بھی اپنے جانے کی اطلاع تو دوں۔"

اس وقت دس بجنے والے تھے۔ دھوپ کی تمازت کچھ زیادہ تیز نہیں تھی لیکن تیز گرم چائے اور گرما گرم بحث نے ماحول کو خاصا گرما دیا تھا۔ زیبو اور افروزہ نے گرم چادریں اتار کر تہہ کر لیں تاکہ برقعہ اوڑھنے میں آسانی رہے۔ اتنے میں ہما ایک ہاتھ میں برقعے اور دوسرے ہاتھ میں ایک اور گٹھڑی سی اٹھائے آتی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے گھر کا ملازم مٹھائی کا ایک ڈبہ اور دو بڑی بڑی ٹوکریاں سنبھالے چلا آرہا تھا۔ ہما نے نوکر سے وہ سب کچھ میز پہ رکھنے کو کہا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی غیر موجودگی میں کئے جانیوالے کاموں کے بارے میں ہدایات بھی دیتی رہی۔ جن میں ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ تمام بستر باہر دھوپ میں ڈال دیئے جائیں تاکہ رات کو گرم ہوں اور کچھ کھانے پکانے کی ہدایت بھی تھی۔

اب تک وہ زیبو اور افروزہ کو اپنے اپنے برقعے پکڑا چکی تھی۔ اپنی اونی چادر اور اوڑھنے والی چدری ایک کرسی کی پشت پر ڈال دی اور وہ گٹھڑی کھولنے لگی۔

"بھابی اس گٹھڑی میں کیا ہے ؟"

عنایت نے حیرانی سے پوچھا۔ اتنی دیر میں گٹھڑی کھل چکی تھی اور ہما اس میں سے نکال نکال کر ایک ایک کو اس کا جوڑا دکھا رہی تھی۔

"زیبو یہ جوڑا تمہارا ہے۔ یہ افروزہ کا ہے۔ یہ رہا بھائی صاحب آپ کا جوڑا یہ جوڑا اور شال مہرو بھابی کے لئے ہیں۔ یہ سب میں نے رات ہی کو باندھ لئے تھے کہ آپ لوگ جب جانے لگیں گے تو دوں گی۔"

یہ سنتے ہی عنایت اللہ لپک کر اپنی کرسی سے اٹھ آیا اور گٹھڑی کی طرف آکر اسے گرہ دے کے واپس کرتے ہوئے بولا۔

"بھلا یہ جوڑے کس خوشی میں بانٹے جا رہے ہیں ؟"

"بھائی صاحب آپ لوگ پہلی بار ہمارے گھر آئے ہیں۔ یہ آپ لوگوں کا حق بنتا ہے۔"

ہما نے کہا۔

"حق تو تب ہوتا جب ہم جاوید کی شادی میں آئے ہوتے آپ یونہی حق جتلانے لگیں ہمارا۔ ہم نہیں لیں گے یہ جوڑے خواہ مخواہ . . . . . . رکھ لیں . . . . اور آئیں چلیں۔ وہ ہے جاوید! گاڑی نکال لایا ہے۔"

عنایت نے زور سے کہا اور گٹھڑی ملازم کو پکڑا دی۔

"چلو اسلم یہ سب کچھ ڈکی میں رکھ دو۔ بھائی صاحب تو غیرت برت رہے ہیں۔"

ہما نے رسان سے کہا۔ وہ کرسی سے شال اور چدری اٹھا کر چلنے لگی اور جاتے جاتے زیبو کو کہا۔

"چلو زیبو تم لوگ بھی آؤ! میں گاڑی میں یہ سامان رکھوا دوں۔"

اتنے میں ڈاکٹر بھی تیار ہو کر نکل آیا تھا۔ عنایت نے شکایت کی۔

"سائیں بھائی! یہ بھابی کن تکلفات میں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ نہیں چلے

گا بھئی۔"

"تو تم مت لوتا بھائی خرابٹر۔ آؤ بیٹھو، دیر ہو رہی ہے۔ گاؤں وقت پر پہنچ جائیں۔ واپس بھی تو آنا ہے۔"

ڈاکٹر نے عنایت کی شکایت کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔

"اب آپ لوگ بھی رات گزار کر ہی آئیں گے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں، جاوید بیٹے کا زیادہ حرج نہ ہو تو دو تین روز رہ لیجیے۔ خوب جی بھر کے باتیں ہوں گی۔"

"یار زندہ صحبت باقی۔ باتیں ہوتی ہی رہیں گی۔ دوسرے جاوید کا فائنل ہے۔ بہت حرج ہوگا۔ دسمبر کی چھٹیاں ہیں تیاری کرے گا اور میں نے جن مریضوں کو کل ٹائم دیا ہے، انہیں بھی مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ بس شام کو واپسی ہو گی۔"

اور اس قسم کی باتوں کے دوران گاڑی گل آباد کی طرف چل پڑی۔ گاڑی ابھی جاوید ولا کے بائیں پھاٹک سے نکلی ہی تھی کہ موسم نے اچانک پینترا بدلا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں سڑک کے دو رویہ کھڑے شیشم، دھریک اور شہتوت کے درختوں سے گرے سوکھے پتوں نے ہوا کے دوش پر ناچنا شروع کر دیا۔ جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی گئی، ہوا میں تیزی آتی گئی، کچھ ہوا کی تیزی سے اور کچھ گاڑی کی رفتار سے ارد گرد سے سوکھے پتے اڑ اڑ کر گاڑی کے پہیوں کے نیچے آ آ کر چُرمرانے لگے۔ کبھی کبھی تو یوں لگنے لگتا جیسے یہ پتے جان بوجھ کر کچلے جانے کے لیے سڑک پر چلنے والی بسوں، ٹرکوں، تانگوں اور موٹروں کے پہیوں تلے آ رہے ہیں تاکہ خزاں نے ان کے حسن کی جو بے قدری کی ہے اس سے جلد سے جلد نجات پائیں۔

یہ سب باتیں سٹیرنگ پر بیٹھے ہوئے جاوید کے ذہن میں آگے کو بڑھتی ہوئی موٹر کی رفتار سے پیچھے کو دوڑتی ہوئی سڑک کے ساتھ ساتھ خود بخود آتی چلی آ رہی تھیں۔ اور اس کے اندر کی اداسی کو اور زیادہ گمبھیر بنا

رہی تھیں۔

جب باڑہ روڈ پر گاڑی ذرا کچھ اور آگے بڑھی تو عنایت نے جاوید کو بائیں ہاتھ کو گاڑی موڑنے کے لئے کہا، کچھ کچا راستہ چلتے ہوئے وہ باڑہ دریا کے کنارے تک آ گئے۔ کنارے کے ساتھ ساتھ گئے ہوئے کچے راستے پر موٹر ہچکولے کھاتی گرد اڑاتی چلی جا رہی تھی۔ وہ دائیں کو ذرا مڑے سامنے کچے پکے مکانوں پر مشتمل گاؤں نظر آیا۔ یہی گل آباد تھا۔ راستے بھر نیم ننگے بچے کچھ دیر تک موٹر کا پیچھا کرتے، جب وہ ذرا پیچھے رہ جاتے۔ تو استقبال کے لئے اسی طرح کے لڑکوں کا ایک اور قافلہ تیار ہوتا جو گاڑی کی معیت میں بھاگنا شروع کر دیتا۔

اور جب گاڑی ایک بڑی سی ڈیوڑھی تک پہنچی تو عنایت نے رکنے کو کہا۔

ڈیوڑھی کے بڑے سے مہیب دروازے میں لگی ہوئی کھڑکی کھلی تھی عنایت اس کھڑکی میں گھس کر اندر غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک سفید ریش صحت مند آدمی نے بڑا دروازہ کھول دیا، موٹر گیٹ میں سے ہوتی اندر چلی گئی اور ڈیوڑھی میں رک گئی۔ اتنے میں عنایت اللہ خاں بمعہ تین چار نوکرانیوں اور بیوی کے آگے بڑھ آیا۔

"بیٹے گاڑی اندر صحن میں لے چلو، گاؤں کے شریر بچے موٹر خراب نہ کر دیں یا پہیوں سے ہوا ہی نہ نکال دیں۔ پھر تکلیف ہو گی۔"

عنایت اللہ خاں آگے آگے جا کر راستہ دکھاتا گیا۔ سامنے دالان کے ساتھ والی روش کے قریب گاڑی رکی، پہلے زیبو اتری پھر افروزہ، پھر ہما۔ مہرو نے آگے بڑھ کر ہما کو گلے لگایا۔ استرے مشٹے خوارہ مشے کرنے کے بعد عنایت نے ڈاکٹر کو بیوی سے ملوایا۔

"یہ ہے میرا بھائی اور جگری دوست ڈاکٹر عبدالمجید سائل"

مہرو نے شرمائے لجائے انداز میں سلام کیا۔ اور دوپٹے کا بکل مارتے ہوتے تھوڑی دیر کو منہ ناک ڈھک لیے۔ لیکن جب عنایت کی نظر پڑی تو اس نے آہستہ سے ٹوکا۔ جس کے جواب میں مہرو نے اپنے چہرے سے دوپٹہ تو سرکا لیا، مگر اس کی نظریں زمین میں گڑ گئیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ ذرا سنبھلی کیونکہ اس کی جوان جہان بیٹی زیبو برقعہ اتارے صرف گرم چادر لپیٹے سیدھی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

اس ملنے ملانے کی گہما گہمی میں جاوید کو سب لوگ کچھ دیر کے لیے بھول گئے تھے، وہ اسی طرح سٹیرنگ پر ہاتھ رکھے موٹر میں بیٹھا رہا۔ شاید وہ کار سے اترنے میں اس لئے بھی ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا کہ ایک ٹھیٹ پشتون گھر میں اندر تک گھس آیا تھا۔ اسے اپنی پوزیشن کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اُسے نامحرم جوان سمجھ کر باہر کسی حجرے یا ڈیوڑھی میں بٹھایا جائے گا یا کہیں اور ——— اس دوران میں ڈاکٹر یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ خود موٹر سے برآمد ہو کر آگے بڑھ کر چچی کو سلام کہہ دے گا۔ لیکن حسب عادت وہ ماں باپ کے حکم کے انتظار میں یونہی بیٹھے کا بیٹھا ہی رہ گیا اور جب باپ کی نظر پڑی تو اس کے ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن ابھری۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، عنایت نے آگے بڑھ کر پہل کر دی۔

"آؤ نا جاوید بیٹے! آؤ اترآؤ! اب تم کس کا انتظار کر رہے ہو؟ یا چچی سے پردہ کر رہے ہو؟ آؤ آؤ، موٹر یہیں ٹھیک ہے۔ آؤ اتر آؤ۔"

جاوید نے باپ کی پیشانی پر خفگی کی ہلکی سی گرد دیکھ لی تھی۔ وہ کھسیانہ سا ہو کر کار سے اتر آیا اور خود ہی آگے بڑھ کر مہرو کو سلام کیا۔

"مہرو بہن، یہ میرا بیٹا جاوید ہے۔ اس سال انشاءاللہ ڈاکٹر بن جائے گا۔" ہما نے تعارف کرایا۔

"نام خدا، اللہ بری نظر سے بچائے رکھے۔ لمبی عمر پائے! آؤ بیٹے

تم بھی آؤ۔ سب اندر چلتے ہیں۔"

" مہرو نے کہا اور اندر دالان میں سے ہو کر جانے لگی۔ مگر عنایت نے روکا۔"

" زیبو کی ماں! باہر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ ہوا تو چل رہی ہے مگر بڑی پیاری دھوپ ہے۔ بری نہیں لگتی اور اگر کوئی بیٹھنا نہ چاہے تو عشق پیچاں کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ سکتا ہے۔ ہوا سے بچا بھی رہے گا اور باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔"

" میں تو کہتی ہوں اندر ہی ٹھیک تھا۔ دھوپ تو ہے مگر پوماہ کی سرد ہوائیں ہیں۔ کمرہ گرم ہے، کرسیوں پر آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔"

مہرو نے پھر وکالت کی۔

" نہیں بس ہم یہیں ٹھیک ہیں بھابی۔ ان چارپائیوں پر بیٹھ جاتے ہیں دھوپ میں بڑا مزا آئے گا۔"

ہما نے جب یہ کہا تو ادھر ادھر پھرنے والی نوکرانیاں دوڑتی ہوئی اس کمرے میں گئیں جس میں زیبو اور افروزہ ابھی ابھی گئی تھیں اور تھوڑی دیر میں وہ صاف ستھرے گدیلوں، چادروں اور تکیوں سے لدی پھندی برآمد ہوئیں۔ ہما نے بہت کہا کہ ننگی چارپائیوں پر بیٹھ جائیں گے۔ مگر وہ مہمان تھے اور پشتون اپنے مہمانوں کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں چنانچہ گدیلے ڈالے گئے، چادریں بچھائی گئیں، گاؤ تکیے لگائے گئے اور مہمانوں کو الگ الگ چارپائیوں پر بٹھا کر ساتھ والی دوسری چارپائیوں پر عنایت اور مہرو بھی بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھی گئی۔ اچانک ڈاکٹر کو بدیع کا خیال آیا۔

" یہ زیبو کہاں غائب ہو گئی۔ نظر ہی نہیں آتی۔"

" وہ اپنے چوزے دیکھنے گئی ہو گی! کل سے بڑی فکر مند تھی۔"

جاوید نے بچے تلے الفاظ اپنے طور پر استعمال کیے۔ مگر ڈاکٹر نے بیٹے کی بیتاب نظروں کا پہلے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ زیبو کو ڈھونڈ رہی تھیں وہ سمجھ گیا کہ جاوید نے کافی دیر سے یہی سوچا ہوگا کہ زیبو اپنے چوزے دیکھنے گئی ہے۔

" چلو ہم بھی چلتے ہیں، زیبو کے مرغی خانے میں چوزے بھی دیکھ لیں گے اور مرغیاں بھی۔"

ہما نے کہا اور جوتا پہننے والی تھی کہ مہرو نے روکا۔

" نہیں وہ رسوئی گھر کی طرف گئی ہے۔ آپ لوگ ذرا ستالیں پھر زیبو کا فارم بھی دیکھ لیں گے اور میرے گھر میں مال مویشیوں اور شہد کی مکھیوں کیلئے جو توسیع ہو رہی ہے وہ بھی دکھا دیں گے۔"

ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد زیبو آتی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی پیچھے پیچھے زرتاجہ کا بلیئے اور افروزہ برآمد ہوئیں۔ افروزہ دالان میں سے بھاگتی ہوئی اندر ایک کمرے میں گئی۔ وہاں سے ایک اور میز اٹھا لائی اور پہلے سے پڑی ہوئی میز کے ساتھ اس کو بھی جوڑ دیا۔ تب تک زیبو نوکرانیوں کی معیت میں چائے کے لوازمات لیے پہنچ چکی تھی۔ وہ باری باری ایک ایک چیز میز پر رکھنے لگی۔ افروزہ نے پیالیاں سجائیں اور چائے بنانے لگی۔ زیبو نے ہر ایک کو ایک کوارٹر پلیٹ پکڑا دی اور جب وہ آہستہ آہستہ بسکٹ، مٹھائیاں اور انڈوں کی سویاں پیش کرنے لگی تو ہما نے دخل در معقولات کے طور پر یونہی تکلفاً کہا۔

" زیبو ابھی تھوڑی دیر ہوئی ناشتہ کیا تھا۔ چائے بھی پی تھی پھر اتنی چیزوں کی ضرورت کیا تھی؟

" ضرورت تو اس لیے پیش آئی کہ آپ لوگوں کو بھوک لگی ہوگی۔ صبح ناشتے میں جو کچھ کھایا پیا تھا وہ راستے میں موٹر کے ہچکولوں نے ہضم کر

دیا ہوگا۔"

عنایت نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"موٹر کے ہچکولوں نے تو نہیں۔ ہاں البتہ میرا ناشتہ بارہ کے ایک گلاس پانی نے ہضم کر دیا ہے۔"

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

"تب ہی آپ نے آنے کے ساتھ ہی پانی مانگ لیا تھا کہ ناشتہ ہضم کرانا تھا۔"

ہما نے مذاق کیا، اس پر سب ہنس پڑے۔

"ڈاکٹر بھائی! یہ سب چیزیں آپ کی اس مریضہ بھتیجی کے کرشمے ہیں ایک لحظہ تو فارغ نہیں بیٹھتی۔ جب فارم سے فرصت ملتی ہے اور طبیعت ذرا ٹھیک ہو تو پھر رسالے اخبار پڑھتی ہے اور جتنے نسخہ جات نظر پڑتے ہیں ان پر طبع آزمائی کرتی رہتی ہے۔ ہاں یہ بتاتا چلوں کہ ہماری بیٹی اپنے گھر کی روٹیاں پکانے والی تندوری استعمال کرتی ہے۔ گاؤں کے کمہار کو ڈیزائن بنا کر پکی مٹی کا ایک سانچہ بنوایا ہے۔ ذرا لانا تو زیبو وہ سانچہ! اچھا چچی کو دکھا دو۔"

اور جاوید نے اپنی پلیٹ میں رکھی ہوئی چیزیں ختم کر کے اور لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ہما نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم تو مٹھائی نہیں کھایا کرتے جاوید! گھر کی بنی کیا بہت پسند آئی ——"

جاوید نے کھسیانہ سا ہو کر جلدی سے ہاتھ پیچھے کو کھینچ لیا۔ جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"جاوید کی ماں! تو کامت کرو اشکر نہیں کرتیں کہ اس بہانے بیٹا کسی چیز سے رغبت دکھا رہا ہے۔"

"نہیں جی یہ بات نہیں ہے، میں تو اسے بازار کی بنی سمجھ رہا تھا لیکن اس سانچے والی بات نے اور حیران کر دیا۔ میں اس کا یہ ڈیزائن دیکھنا چاہتا تھا۔"

اور زیبو صرف محسوس کئے جانے والے راستے سے چپکے ہی چپکے جاوید کے قریب کھسک آئی۔

دوپہر کا کھانا بھی بڑا ہی پر تکلف تھا مُرغ کے تکّے کباب خاص طور پہ سب نے بڑی رغبت سے کھائے۔

آج ڈاکٹر کی اشتہا خاصی تیز تھی۔ ماں بیٹے دونوں نے یہ بات محسوس کی۔ آخر ہما سے نہ رہا گیا۔

"جاوید کے ابا! آج تو لگتا ہے کھانے کے معاملے میں اپنی ڈاکٹری کے تمام اصول بالائے طاق رکھ چکے ہیں۔"

"کون کافر ایسی لذیذ خوراک کے آگے صبر کے بند باندھ سکتا ہے اور کفرانِ نعمت میرے نزدیک فعل حرام ہے اور دوسرے یہ کہ زیبو بیٹی نے جب خاص اہتمام سے یہ سب کچھ تیار کروایا ہے۔ تو اس کی حوصلہ افزائی بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس بات سے سب لوگ بہت محظوظ ہوئے۔

"لیکن سائل بھائی مُرغ کے تکے کباب کا کریڈٹ تو تمہاری بھابی ہما کو جاتا ہے۔ یہ اسی کی تیار کردہ ڈش ہے۔"

عنایت اللہ خان نے بیوی کو مستحسن نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ڈاکٹر کو بتایا۔ اس پہ ڈاکٹر نے برجستہ کہا۔"

"تو ماں کس کی ہے، آخر کو زیبو ہی کی ماں ہوئی نا۔"

دسترخوان قہقہوں سے زعفران زار بن گیا ـــــ کھانے کے بعد مختلف پھل پیش کئے گئے۔ جن میں ریڈ بلڈ، مالٹا سب کو بہت بھایا پھل

ایک تو گارڈن فریش تھے۔ دوسرے گھر میں ارد گرد لگے ہوئے پودوں سے مہمانوں نے خود چن چن کر اپنے ہاتھوں سے اتارے تھے سنگترہ بھی بڑا لذیذ تھا۔ خاص طور پر ہما کو بہت پسند آیا۔ جاوید نے بھی آج بڑی مدت بعد کھانا اور پھر پھل خوب جی لگا کر کھایا تھا۔

جاوید نے ایک صحت مند تازہ سا سنگترہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جس نے یہ درخت لگائے ہیں ان کا بھی شکریہ! لیکن ہماری محنت بھی ان میں شامل ہے۔ کیونکہ ہم نے خود ہی بڑی مشکل سے توڑے ہیں۔ پودوں کے کانٹوں نے ہاتھ لہولہان کر دیئے ہیں۔"

"کیوں نہیں، وہ ہم پشتو میں کیا کہتے ہیں کہ "پہلے کھاؤ اپنا گوشت پھر کھاؤ شکار کا گوشت۔" پودے اپنا پھل اتنی آسانی سے تو نہیں چھوڑتے۔ کانٹے پھلوں کے چوکیدار جو ٹھہرے!"

زیبو نے جاوید کی بات کا جواب دیا۔

"تو کیا یہ ضروری تھا کہ شکار میں ہمارے ہاتھ ہی لہولہان ہوں۔ کھایا تو ہم نے منہ سے ہے وہ تو سلامت ہے۔ بلکہ سب چٹخارے تو زبان ہی نے لوٹے۔"

جاوید نے زیبو کو اپنے طور پر قائل کرنے کی کوشش کی۔

"تو آپ کے ہاتھ نہ مانتے آپ کے منہ اور زبان کی چٹخارے والی خواہش۔ پھل تک آگے بڑھنے سے پہلے ذرا سوچ لیتے۔ پھر نہ بنتی ان کی یہ گت!!"

ساتھ کھڑی ہوئی افروزہ کے منہ سے اچانک یہ بات سن کر جاوید کچھ سٹپٹا گیا۔ ابھی وہ بات کرنے کو منہ کھول ہی رہا تھا کہ ماں کی آواز آئی۔

"جاوید بیٹے! اتنی مدت بعد دیکھ رہی ہوں کہ شوق سے کوئی چیز کھانے لگے ہو، اب بحث مباحثے میں مت الجھو، ورنہ کھا نہ سکو گے۔"

"اگر یہاں نہ کھا سکا تو گھر جا کر کھا لے گا۔ آج صبح عنایت بھائی

تو انہی پودوں کے پھل ہمارے ہاں لایا تھا۔ میں سمجھا تھا بازار سے خریدے ہوں گے۔"

ڈاکٹر نے بیوی سے کہا۔

" ساتھ اور بھی لے جائیں! خود بھی کھائیں۔ دوست احباب کو بھی کھلائیں۔ فارم کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بھی پودے لگے ہوئے ہیں۔ اس سال پھل بہت ہوا ہے۔ آیئے اب آپ کو سیر کراؤں۔"

سب نے ہاتھ منہ دھو کر صاف کئے اور خوشی خوشی سیر کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ عنایت اللہ خاں ساتھ ساتھ بتاتے گئے۔

"پچھلے سال محکمہ زراعت سے ایک ماہر کو بلوایا تھا، میاں صاحب کہلاتے ہیں۔ بہت سمجھ دار شخص ہے۔ ہمارے پھلوں کے تمام پودے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے تھے۔ آم کا ایک بیمار سا پودا تھا، نکلوا دیا۔ چکوترے کے پودے کی قطع برید خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ آلو بخارے ناشپاتی، آڑو اور سفیدے کے پودے لگانے کا مشورہ دیا۔ خاص طور پر سفیدے کے درخت لگانے کی تاکید کر گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے یہاں پانی ذرا نسبتاً زمین کی سطح کے زیادہ قریب ہے۔ سفیدے زمین کا زائد پانی پی لیتے ہیں۔ پچھلے مارچ میں کہا تھا اب کے انشاء اللہ جنوری، فروری میں سفیدے کے پودے لگانے کا خیال ہے۔"

جس وقت سے جاوید موٹر اندر لایا تھا اور ان سب کو ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر اس سفید ریش ملازم غندل ماما نے سلام کیا تھا۔ تب سے لے کر اب تک وہ محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے اور اس گھر میں اب تک جو کچھ ہوا تھا یا ہونے والا تھا، وہ سب خواب کی دنیا کی باتیں تھیں۔

جاوید مکینوں کے ساتھ ساتھ اس مکان کی مکانیت کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ ڈیوڑھی کا فرش پختہ تھا اور موٹر جہاں سے گزر کر گھر کے اندر گئی تھی۔ وہ روش بھی پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی اور اس کے دونوں طرف

صحن کا بقایا حصّہ کچا تھا۔ لیکن صاف ستھرا اور لیپ شدہ لگ رہا تھا۔

مکان کی چار دیواری پکی اینٹوں کی بنی تھی۔ لیکن باقی تمام آبادی کچی تھی۔ جس کمرے میں انہوں نے میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ وہ باہر سے کچا لیکن اندر سے پکا تھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے جو بڑا سا دالان تھا اس میں اندر ایک ہی قطار میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہر کمرے کے باہر چق لگی تھی۔ دالان اور کمروں کا رُخ شمال کی طرف تھا۔ دائیں ہاتھ کو کچھ گز تک گزر کر دالان مڑا ہوا تھا اور اس رُخ پر رسوئی گھر اور اس سے ملحقہ غسل خانے تھے۔ گھر کے اندر ۲ دو اور غسل خانے مشرقی دیوار کے ساتھ بنائے گئے تھے۔ دائیں ہاتھ کو ایک دروازہ تھا اسی دروازے میں سے یہ لوگ ہوکر زیبو کے فارم میں داخل ہوئے تھے۔

فارم کے تین حصّے تھے، ایک حصّے میں بڑی مرغیاں اور مرغے پھر رہے تھے اردگرد جالی لگی تھی، دوسرا حصّہ زمین سے ذرا اوپر لکڑی کے تختوں کا بنایا گیا تھا، ساتھ چوڑی پٹی والی کشمیری طرز کی سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ لیکن اس سیڑھی کا ڈھلوان عمودی کم اور افقی زیادہ تھا۔ پوچھنے کی حاجت ہی نہیں رہی تھی کیونکہ جب یہ لوگ اندر داخل ہوئے اور اردگرد نظر دوڑا رہے تھے، اس وقت دو تین مرغیاں سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھیں اور اسی طرح چار پانچ مرغیاں اوپر سے نیچے کی طرف آ رہی تھیں۔ کچھ مرغ اِدھر اُدھر مرغیوں کی چوکیداری کے لئے زور زور سے بولتے ہوئے پھر رہے تھے۔ اکثر مرغیاں اپنے اپنے انڈے دینے کی نوید دے رہی تھیں اور بڑی شان اور تمکنت سے سیڑھی سے نیچے اوپر آجا رہی تھیں۔

اسی سیڑھی کے نیچے کچھ ٹاپے بنائے گئے تھے۔ جن میں چند مرغیاں کٹ کٹ کر رہی تھیں، جب یہ قافلہ ان کے قریب آیا تو چوزوں کی چوں چوں سے سمجھ گئے کہ یہاں مرغیاں انڈوں پر بٹھائی گئی ہیں۔ جاوید ذرا سا شرماتا ہوا بولا۔

"یہ مرغیوں کا لیبر روم ہوگا؟"

"ہاں! تمہاری اصلاح میں یہ لیبر روم ہی ہے اور جن چوزوں کے بھوکے

ہونے کی کل سے زیبو کو فکر تھی وہ ہے۔ ادھر ماں کے ساتھ نرسری ہوم میں کھیل رہے ہیں۔"

عنایت نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

نرسری ہوم میں ذرا کچھ بڑی عمر کے چوزے بھی تھے۔ جن میں اب نر اور مادہ کی پہچان ہو سکتی تھی۔

"جب یہ لوگ انڈے دینے کے قابل ہو جائیں گے تو اس خانے میں شفٹ ہو جائیں گے۔ جس میں بڑی مرغیاں اور مرغے رکھے ہیں۔"

زیبو نے چچا کو مخاطب کر کے کہا۔

"'یہ لوگ' لفظ خوب رہا۔"

جاوید لوگ لفظ پر زور دیتے ہوئے مسکرایا۔

"ہاں بیٹے، یہ زیبو کی تنہائی کے ساتھی ہیں انہی سے دل بہلاتی رہتی ہے۔ اس واسطے یہ بے زبان اس کے لئے 'لوگ' ہیں۔ اکیلی ہے کیا کرے!"

مہرو نے جاوید کو جواب دیا اور جاوید کے دل میں زیبو کی تنہائی کے احساس نے چپکے سے ایک چٹکی لی۔

"آیئے۔ اب آپ کو وہ حصہ دکھاؤں۔ جن میں بھیڑ بکریاں رکھی جائیں گی اور شہد کی مکھیوں کا بھی ذرا سا تماشا دیکھ لیتے ہیں۔"

مرغی خانے کا چکر لگاتے لگاتے اب بیلا بالکل قریب آ چکے تھے۔

"جاوید بیٹے! دیکھو گاؤں کی یہ پرسکون زندگی کتنی خاموشی ہے۔ جی چاہتا ہے اپنا کلینک کسی گاؤں میں کھول لوں۔"

"معافی چاہتا ہوں اباجی۔ آپ کی بات سے ذرا سے اختلاف کی جرأت کر رہا ہوں۔ گاؤں اور دیہات میں بیماریاں زیادہ تر جسمانی ہوا کرتی ہیں جو دوا دارو سے ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ نفسیاتی کیسز زیادہ تر

شہروں میں ہی ہوتے ہیں۔" لیکن انسانی زندگی کی اقدار ہر جگہ بدل رہی ہیں۔ شہروں میں اگر رضیہ جیسے لوگ نفسیاتی گورکھ دھندوں کے شکار ہو سکتے ہیں۔ تو دیہی آبادی میں بھی زیبو جیسے لوگ ان الجھے دھاگوں کے سروں میں سے ایک سرا ہیں جو سلجھانے دفعہ ٹوٹ چھوٹ جاتے ہیں۔"

"لیکن زیبو بھی ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی سوچ کی دھارا اوروں سے اس وجہ سے مختلف ہو!"

جاوید کے منہ سے جب زیبو کا نام نکلا تو افروز نے ایک اچٹتی نگاہ جاوید پر اور پھر زیبو پر ڈالی۔ جاوید کی نظر باتیں کرتے ہوئے زیبو پر گڑی تھی۔ لیکن زیبو اپنے حال میں مست چچی کو اپنی کارگزاریاں بتا رہی تھی کہ کس طرح اس کے دل میں اس فارم کے کھولنے کا خیال ابھرا اور کن کن لوگوں کو اس نے اپنے کام میں شریک کیا، اور کس طرح اس کی ماں نے پہلے پہل تو اس کی مخالفت کی اور اب وہ بھی ایک طرح کی سرپرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا کافی ہاتھ بٹا رہی ہے۔ مرغیوں کے انڈے اکٹھے کرنے کا کام اپنے ذمے لے رکھا ہے اس کے علاوہ سبزی ترکاری اپنی نگرانی میں لگواتی اور کٹواتی ہے۔

ڈاکٹر نے جب بہت سے لوگوں کو ادھر ادھر مختلف کاموں میں مصروف پایا تو کہا۔

"آپ کے فارم میں تو کافی عملہ کام کر رہا ہے۔"

اس پر عنایت نے جواب دیا۔

"یہ بھی ناکافی ہے ۔ گاؤں کی تمام تیار خور عورتوں کو زیبو نے مصروف رکھا ہوا ہے۔ مرغیوں کا گند اس مقصد کے لئے کھودے ہوئے گڑھوں میں ڈال کر، ان پر مٹی ڈالنا کہ کھاد میں تبدیل ہو، درختوں، پودوں کو پانی دینا، جن لوگوں کے ساتھ ٹھیک ہے ان تک انڈے پہنچانا ہے۔ سب کام

انہی لوگوں سے لیا جاتا ہے اور اگر اڈ کام نہ ہو، تو پھر سبزی ترکاری کے لئے کیاریاں بنانا اور ہوائی کرنا، گوڈی وغیرہ سب یہی لوگ تو کرتے ہیں۔ اتنی سبزی پیدا ہوتی ہے کہ شاید ہی کوئی سبزی فروش گل آباد کا رُخ کرتا ہو۔"

"سبزی بھی بیچی جاتی ہے؟" جاوید نے سوال کیا۔

"نہیں بیٹے! وہ ضرورت مندوں میں مفت بانٹی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ لینے والا کہیں نہ کہیں محنت مزدوری کر رہا ہو۔ ورنہ مفت خوروں کے لئے زیبو بڑی کنجوسی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ پیاز کی ایک گانٹھ تک بیکار لوگوں کو نہیں دیتی۔"

طاہر نے جاوید کی بات کے جواب میں کہا۔

"یوں لگتا ہے جیسے کسی اخبار، رسالے میں فرضی کہانی پڑھ رہا ہوں یا کسی خیالی دنیا کی سیر کو نکلا ہوں۔"

جاوید نے آنکھیں بھینچی ہوئی تھیں اور وہ کسی اور سمت کو نکل چکا تھا۔

"اگر ہمارے ملک کی یہ تیس چالیس فیصد آبادی، جو یونہی بیکار بیٹھی رہتی ہے۔ اسی طرح کی سوچ اپنا لے تو ہمارا یہ زرخیز ملک کیوں غربت کا کشکول گلے میں لٹکائے غیروں کے دیار پر ماتھا رگڑے، ڈاکٹر نے کہا۔

"لیکن اباجی! عمل ساتھ نہ ہو تو صرف سوچ سے کیا ہوتا ہے۔"

ہاں بیٹے تم بھی صحیح کہہ رہے ہو۔"

اتنے میں سب لوگ فارم کے دوسرے زیرِ تعمیر حصے میں پہنچ چکے تھے۔ جا بجا سبزی ترکاری لگی تھی۔ کچھ موسمی پھول بھی مہک رہے تھے۔ پھل دار درخت بھی نظر آرہے تھے اور بیچ بیچ میں فاصلوں سے شہد کی مکھیوں کے بکس پڑے تھے۔ لیکن وہاں پر اکا دکا مکھی آ جا رہی تھی۔

"غالباً ان کی نیند کا موسم آ چکا ہے۔ اس لیے اس آبادی میں ذرا خاموشی ہے۔"

ڈاکٹر نے اپنی رائے ظاہر کی۔

جی ہاں بالکل۔ اب بقول زیبو یہ لوگ ' استراحت فرما رہے ہیں۔"

عنایت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کتنی اچھی مخلوق ہے۔ ان کی زندگی میں کتنا توازن ہے، کتنا نظم و ضبط ہوتا ہے۔ جس کو جو ڈیوٹی سپرد کر دی گئی ہے۔ مرتے تک وہ تن من دھن کی بازی لگا کر پوری کرتا ہے۔ نہ آپس میں جھگڑا نہ فساد! بس کام کی ایک لگن ہے۔ اپنے کام سے کام، نہ سستی دکھاتے ہیں۔ نہ ریاکاری سے کام لیتے ہیں۔ اپنی ماں کے اشارے پر تمام اولاد چلتی ہے۔ اپنی دھن میں مست و سرشار۔

ڈاکٹر فلسفیانہ انداز میں بولا۔

"ہاں! بات ساری اپنے کام سے لگن کی ہے۔" جاوید نے زیبو کی طرف دیکھتے ہوئے باپ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بالکل! اب دیکھو اپنے اس چچا کو، جب ہم کالج میں پڑھ رہے تھے تو میرا خیال میڈیکل کی طرف تھا اور ان کا زراعت کی طرف، اور اس قدر مائل تھے یہ زراعت کی طرف کہ اپنا تخلص تک معلوم ہے کیا رکھا تھا۔ خرد ہڑ ——— جانتے ہو۔ خرد ہڑ کے معنی کیا ہیں۔ یعنی مٹیالا، مٹی اور دھول سے اٹا ہوا!"

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے ایک جاندار قہقہہ لگایا۔ جس کی آواز پر تمام خواتین چونک پڑیں۔

"کیا چچا شاعر بھی تھے؟" جاوید نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اور اپ کا نہیں پوچھتے، یہ بھی ایک عدد تخلص کا مالک تھا۔"

عنایت نے جاوید کو ایسے انداز میں بتایا جیسے گویا اپنا بدلہ لیا ہو۔

"وہ تو میں جانتا ہوں ان کا تخلص۔ اب بھی کئی قریبی دوست ابا جی کو سائل کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ شاعری کا شوق غالباً اب بھی جاری ہے؟ یہ شاعری اور ڈاکٹری میں پیوند کاری کیسے کر لیتے ہو؟"

عنایت نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔

"ڈاکٹری میرا پیشہ ہے اور اسے زندگی کا ایک عظیم مقصد سمجھتا ہوں۔ رہی شاعری — تو — وہ کبھی کبھار بس شوقیہ کچھ کہہ لیتا ہوں۔"

"وہی ہنسی مذاق اور لوگوں کی پیروڈیز لکھا کرتے ہو یا کچھ سنجیدگی بھی آگئی ہے۔ تمہاری شاعری میں؟"

عنایت نے بات کو آگے بڑھایا۔

"اب میں اپنے پورے معاشرے پر ہنسا کرتا ہوں۔ اب میں غلط خاندانی روایات کا مذاق اڑایا کرتا ہوں، جنھوں نے ہمارے ذہنوں کو جکڑ رکھا ہے۔ ہمارے دلوں میں نفرتوں کے بیج بوئے ہیں میں ان خود ساختہ خوانین کی جکڑبندیوں پر طنز کرتا ہوں۔ جنھوں نے ہماری گھریلو زندگیاں جہنم میں جھونک دی ہیں۔"

ڈاکٹر کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔

"تم جوان تلخیوں کا صرف اشعار میں اظہار کر لیتے ہو تو کیا یہی ان کا علاج سمجھتے ہو؟"

عنایت پر بھی بڑی سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔

"نہیں!! علاج کے لئے میں دوسری لائن اختیار کر چکا ہوں اور یہ ہے میری میڈیکل کی ڈگری — انسانی نفسیات سے دلچسپی اور

ان دونوں کا ملاپ کر کے اپنے مریضوں پر ان کے عملی تجربات اور پھر مثبت نتائج کا حصول، ہاں بھئی خرہ پڑ صاحب تمہاری شاعری کس ڈگر پر چل رہی ہے؟"

ڈاکٹر نے اچانک سوال کیا۔

"میری شاعری تو میرے کھیتوں کی منڈیروں پر گامزن ہے جب میں ٹریکٹر چلایا کرتا ہوں، کھرپے سے گوڈی کیا کرتا ہوں۔ کدال سے مٹی کے تودے اور ڈھیلے توڑا کرتا ہوں اور بیج بوتا ہوں تو اشعار کی جگہ حیات پرور تیغ اور کونپلیں پھوٹا کرتی ہیں۔"

عنایت اللہ خان نے پوری طمانیت سے جواب دیا۔

"مطلب یہ ہے کہ اپنے تخلص خرہ پڑ سے پرانا یارانہ توڑ چکے ہو؟"

"اب تو دوستی اور بھی مضبوط ہو چکی ہے کہ اب میں عملی طور پہ خرہ پڑ ہو چکا ہوں۔ دیکھو نا، تم نے تو کیا پتہ کس ملک کے بنے ہوئے کپڑے کا سوٹ پہنا ہے۔ جاوید بیٹے کا یہ پہنا ہوا سوٹ اور ٹائی جانے کس ملک کے کارخانوں میں بنے ہوں اور ادھر مجھے دیکھو میرے تن پہ یہ کپڑے میرے اپنے کھیتوں کی کپاس کے بنے ہیں میرے کمروں میں لگے پردے، میری کرسیوں پر، صوفوں پہ، میزوں پر پڑے پوش، میرے بستر، سب کے سب میرے اپنے ہاتھ کی اگائی گئی کپاس کی روئی کے بنے ہیں۔

"چچا جان ابا جی نے بھی دوسرے ملک کا کپڑا کبھی نہیں خریدا اور جب باپ بدیسی کپڑا انہیں پہنتے تو بیٹے کو یہ جرأت کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ دیار غیر سے درآمد کپڑے کے سوٹ پہن کر فخر کرتا پھرے۔ یہ فخر میرے اپنے ملک کو کیوں نصیب نہ ہو؟"

"شاباش بیٹے! مجید بھائی کے بیٹے سے یہی توقع تھی" عنایت اللہ نے جاوید کو تھپکی دیتے ہوئے فخریہ کہا۔

"غالباً یہ جگہ ابھی نئی بن رہی ہے۔ یہاں پر کیا بنانے کا ارادہ ہے بھائی صاحب؟"

ہما نے موضوع کا رُخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔

"بھابی اس حصے میں بھیڑ بکریاں رکھنے کا پروگرام ہے" مہرو نے بتایا

"چند بھیڑ بکریاں تو اُدھر اس باڑھ میں بند ہیں، کیا زیادہ پالنے کا ارادہ ہے؟ جو یہ توسیع ہو رہی ہے۔"

"ہاں لیکن اچھی نسل کی بھیڑ بکریاں ملنے کی شرط پر! ویسے ان موجود بھیڑ بکریوں کو بھی ادھر شفٹ کرنا ہے۔ کیونکہ جب بھی شہد کی مکھیاں کسی بات پر ناراض ہو جائیں تو پھر شامت ان بے زبانوں کی آجاتی ہے۔ ان کی تھوتھنیوں اور ٹانگوں کے ساتھ چمٹ جاتی ہیں اور زیبو کو رونے کا ایک بہانہ ہاتھ آجاتا ہے"

مہرو نے یہ کہا اور زیبو کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

زیبو جو بڑی دیر سے جھک جھک کر چپ ہو گئی تھی۔ باپ اور چچا کی باتوں کو دھیان سے سن رہی تھی، جھینپی۔ اس کی نگاہ غیر شعوری طور پر جاوید کی طرف اٹھ گئی، وہ کھسیانی سی ہوئی اور جلدی سے بولی۔

وہ اب اتنی بچہ بھی نہ سمجھیں کہ بات بات پر بس روتی ہی رہتی ہوں گی۔ دراصل چچی جان ایک بار ایسا ہوا تھا کہ ہمارے ہاں چند مہمان خواتین آئی تھیں۔ ان کے ساتھ بچے بھی تھے۔ انہوں نے شرارت میں آکر ان مکھیوں کو چھیڑا اور خود بھاگ کھڑے ہوئے اب انہیں بھی اپنا دفاع کرنا تھا۔ اس وقت یہ بے چاریاں باہر سے چل کر باڑھ میں اندر آرہی تھیں، ساتھ گوالا لڑکا بھی تھا۔ چنانچہ تمام

مکھیاں اس گوالے لڑکے اور ان بے زبانوں کے ساتھ چمٹ گئیں اور آپ تو جانتی ہیں کہ شہد کی مکھی بیچاری جب بہ حالت مجبوری کسی میں اپنا ڈنگ چھوڑ دیتی ہیں تو ان کی اپنی زندگی بھی خطرے سے دوچار ہو جاتی ہے۔ اس پر مجھے ان بپھری ہوئی مکھیوں اور ان بے زبان بھیڑ بکریوں پر بے طرح ترس آ گیا۔ میرے دکھ مارے آنسو نکل آئے۔ یہ اس طرف اسی کا اشارہ تھا۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"وہ تو ہم جانتے ہیں کہ ہماری زیبو بیٹی، بلکہ زیب النسا عنایت ایک بہادر لڑکی ہے جس پر ماں باپ سے زیادہ اس چچا کو فخر ہے۔" ڈاکٹر نے بڑے مان سے زیبو کو دیکھ کر کہا۔

"ایک زندہ قوم کی بیٹیوں سے یہی توقع کی جا سکتی ہے۔"

جاوید نے بھی اظہار تحسین کیا اور زیبو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک قدم اور آگے بڑھ آئی ہو۔ شام کی چائے پر بھی اسی قسم کی باتیں ہوئیں۔ اس اثنا میں ڈاکٹر کو ایک بات یاد آ گئی۔

"عنایت تم نے اپنی زمین پر بھی اس قسم کے درخت لگائے ہوں گے نا۔ باقی فصلوں میں سے کس فصل کی کاشت زیادہ کرتے ہو؟"

"نہیں فصل اگانے والی زمین پر میں درخت نہیں لگاتا۔ اس طرح زمین کمزور ہو جاتی ہے اور باقی کی فصلوں کے معاملے میں، میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ غلہ اگاؤں اور اس طرح ملک کو غلہ دانے کے معاملے میں خود کفیل بنانے میں اپنے حصے کا فرض ادا کرتا ہوں۔"

"کیش کراپس (CASH CROPS) کی طرف کیوں زیادہ توجہ نہیں دیتے؟ اکیلے آدمی ہو بڑی آسانی سے پیسہ ہاتھ آیا کرے

گا۔ غلّہ انہی پیسوں سے خریدا بھی جا سکتا ہے۔"

"میں نے کہا "ناکہ اپنے حصّے کی ذمہ داری پوری کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ زمینوں پہ غلہ ہی اگاتا ہوں۔ نقد فصلوں کی بات درست ہے، پیسہ بڑی آسانی سے ہاتھ آجاتا ہے اور پیسہ ہی ہر چیز خرید سکتا ہے۔ لیکن ذرا سوچو تو، میں بھی کیش کراپس اُگاؤں۔ تاکہ نقد پیسہ وصولوں۔ تم بھی یہی سوچو، دوسرے زمیندار بھی اس طرح کی سوچ رکھیں۔ ملک میں گنا۔ چقندر، تمباکو وغیرہ نقد فصلیں ہی اُگتی رہیں تو بات پھر وہیں کی وہیں رہ جائے گی پیسہ چیزیں تو خرید سکتا ہے۔ لیکن پیٹ میں اناج کی جگہ نہیں ڈالا جا سکتا اور اسی طرح ہم کشکول گلے میں لٹکائے دوسرے ممالک کے دست نگر بنے رہیں گے۔"

"چچا جان آپ کی سوچ تعمیری سوچ ہے، کاش، ہمارے ملک کے باقی زمیندار بھی اسی طرح سوچنا شروع کر دیں۔"

"صرف سوچ سے تو آپ والی بات پر عمل نہیں ہو سکے گا۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ حکومت کو اس بارے میں ایک ایسا قانون لاگو کرنا چاہیے جس میں ایک طرح سے جبراً ہر زمیندار اپنی قابل کاشت زمین پہ نقد فصلوں کے ساتھ ساتھ ایک خاص تناسب سے غلّہ بھی اُگانے پر مجبور ہو۔"

زیبو نے بھی اس بحث میں حصّہ لیا۔

"ہاں اس طرح یہ تو ہو جائے گا کہ ہر زمیندار کم از کم اپنی ذاتی ضروریات کے مطابق غلّہ دانا تو پیدا کر سکے گا۔ یہ کیا کہ اپنی خاصی قابلِ کاشت زمین کا مالک ہوتے ہوئے بھی ایک کاشتکار بوری کندھے پہ رکھے اناج دوسروں سے، یا ڈپوؤں سے خریدتا

پھرے اور اپنی زمینوں سے صرف پیسے کما کر جیبیں بھرتا رہے کب تک پیٹ کا تندور بھرنے کے لئے حکومت باہر سے غلّہ منگوانے پر مجبور ہوتی رہے گی ــــ"

جب ڈاکٹر ہما اور جاوید شام کو رخصت ہونے لگے تو وہ ہرد کو بھی کسی فرصت کے وقت اپنے ہاں آنے کی دعوت دے گئے تمام دن عنایت اللہ خان کے مختصر سے خاندان کے ساتھ گزارنے کے بعد یہ چھوٹا سا قافلہ واپس مال روڈ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر اس بات پر بڑا مسرور تھا کہ اسکی مریضہ زیبو اب بالکل تندرست ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کے ماں باپ دونوں نے زیبو کو میٹرک کے بعد آگے پڑھانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ بلکہ اس کی آگے پڑھائی کے سلسلے میں ہما کی تجویز کی بھی سب نے حمایت کی تھی۔ اس طرح سے زیبو کو روزانہ گاؤں آنے جانے کی حاجت ہی نہیں رہے گی۔ اگر وہ ڈاکٹر چچا کے ہاں اٹھ آئے۔ ہوسٹل میں قیام کی تو سب نے مخالفت کی تھی۔

جب یہ فیصلے ہو رہے تھے تو زیبو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے تھے جب باپ نے ان بے وجہ آنسوؤں کا سبب پوچھا تو ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔

"زیبو بیٹی! وہ ڈائیلاگ بولو نا کہ نہیں بابا یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔" اس پر سب ہنس پڑے۔ زیبو بھی مسکرائی اور آنسو پونچھے اور صرف اتنا کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں تھی، ویسے ۔ ۔ ۔ ۔"

"ویسے ان کو اپنے چوزوں اور مرغیوں اور بھیڑ بکریوں کی جدائی کا صدمہ رلا رہا ہوگا۔" جاوید نے برجستہ کہا اس پہ ایک بار پھر ایک

قہقہہ پڑا اور زیبو کانوں تک سرخ ہو گئی۔

اور اب ہر دوسرے تیسرے زیبو اور افروزہ گاؤں ہو آتی تھیں ان کو ڈرائیور گاڑی میں لے جایا کرتا تھا کبھی کبھار جاوید چھٹی کے روز اکثر ڈاکٹر اور بھابھی ساتھ چلے جاتے تھے۔ پھر وہ بھی اکثر وبیشتر آنے جانے لگی تھی۔ اور ڈاکٹر سعید المجید اور عنایت اللہ خان ایک دوسرے کے لیئے پھر سے وہی ساتھی اور رفیق بن چکے تھے، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی قریب ہو گئے تھے۔

صلاح یہ ٹھہری تھی کہ زیبو سر دست کالج میں داخلہ نہ لے، بلکہ پرائیویٹ ایف اے کی تیاری شروع کر دے اور اب اس کی مصروفیات اور بھی بڑھ گئی تھیں اور اس کی صحت آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی، ڈاکٹر کا تجزیہ درست تھا۔ زیبو نفسیاتی مریضہ تھی اور اب اس کو احتیاطاً صرف ٹانک دیئے جا رہے تھے۔

جاوید گو کہ سائنس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ لیکن وہ زیبو کو پڑھائی میں خاصی مدد دے رہا تھا۔ زیبو اس کی توقعات سے زیادہ ذہین نکلی۔

زیبو کا مضمون تاریخ تھا اس نے اسی سال ایف اے کا امتحان دیا اور جب نتیجہ نکل آیا تو سب کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ زیبو نے اچھے نمبروں سے سیکنڈ ڈویژن لے لی تھی۔

اور جاوید اس کو اور اپنے قریب محسوس کرنے لگا تھا۔

شفیق اپنے حجرے میں اپنے لنگوٹیے زین خان کے ساتھ بیٹھا ہوا کسی اہم معاملے پر بات چیت میں مصروف تھا۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس میں مدّو ضل کی موجودگی نہایت ضروری تھی۔ لیکن وہ ابھی تک حجرے میں نہیں آیا تھا۔

مدّو ضل اور زین خان اسی گاؤں گل آباد کے رہنے والے تھے دونوں آپس میں چچا تایا کے بیٹے تھے زین خان نے تو بالکل نہیں پڑھا تھا۔ لیکن مدّو ضل کو اسکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ لیکن پرائمری کے بعد اس نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اس کا اپنا نام محمد افضل تھا لیکن بگڑ کر مدّو ضل بن گیا تھا۔ وہ اسکول کے زمانے ہی سے شفیق کا گہرا دوست تھا۔ جب مدوضل کا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہو گیا تو اس کے باپ کے علاوہ شفیق اور شفیق کے باپ کریم خان نے کافی سمجھایا۔ بہت جتن کیے کہ محمد افضل اپنی پڑھائی جاری رکھے۔ لیکن اسے باپ کا پیار اور مار اور دوستوں کے مشورے بھی آمادہ نہ کر سکے اور جیت محمد افضل ہی کی ہوئی۔ وہ تمام دن مرغے لڑاتا، کبوتر اڑاتا، درختوں پر سے پرندوں کے گھونسلوں سے انڈے اور بچے اتارا کرتا۔ اس کے اس شغل میں اس کا تایا زاد زین خان بھی اس کا ساتھ

دیتا۔ پھر جب وہ ذرا بڑا ہوا تو باقی شوق تو صرف وقتی شوق ہو کر رہ گئے لیکن کبوتر بازی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گئی اور اب اس کے پاس مختلف نسل کے بے شمار کبوتر جمع تھے جن کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا۔

وہ روز اپنے کوٹھے پر چڑھ کر سیٹیاں بجاتا، کبوتروں کا جال لہراتا اور ان کے جھنڈ کو مختلف ٹولیوں میں بٹتا، اکٹھا ہوتا، قلابازیاں کھاتا، دیکھتا رہتا، اس کے پاس طرح طرح کے کبوتر تھے: یہ لال شیرازی ہے یہ لقا کبوتر ہے اور سیاہ چپ ہے اور جانے کون کون!

اس گاؤں گل آباد میں جہاں سمندر خاں ملک کی اولاد، ان کے دھقان اور مزارعے بس رہے تھے۔ جن کا گزر بسر زمینوں کی پیداوار پر منحصر تھا۔ میاں محمد یوسف جیسا سفید پوش بھی آباد تھا۔ جن کی روزی کا دار و مدار دن رات سرکار کی خدمت پر تھا۔ وہیں پر دوسرے کسب گر بھی رہتے تھے جن کا ذریعہ معاش خان خوانین اور نوکر پیشہ افراد کی خدمت کا مرہون منت تھا۔ ان میں کمہار، لوہار، ترکھان نائی وغیرہ قبیل کے لوگ شامل تھے۔ محنت مزدوری جن کا شعار تھا۔ لیکن ایسے لوگوں کی کمی بھی نہیں تھی جو کوئی خاص کام نہیں کرتے تھے

لیکن زندہ تھے۔ یہ لوگ یا تو کسی حجرے وغیرہ میں ادھر ادھر پھرتے رہتے، کسی کی چلم بھر دی، کسی کے آگے پیچھے ہوئے، حجرے میں کوئی مہمان آیا، گرمی کے موسم میں ان کو ہاتھ کا پنکھا جھلا، ان کے ہاتھ دھلائے اور ان کا بچا کھچا کھا لیا۔ وہ لوگ اس گاؤں میں رہتے تھے جو اس قسم کے کام کرنا کسر شان سمجھتے تھے چنانچہ وہ جوا باز بن جاتے تھے اور جوا کھیلنے کے لئے پیسے چھوٹی موٹی چوریاں کر کے پیدا کیا کرتے تھے پھر ذرا حوصلہ بڑھ جاتا تو ڈاکے اور رہزنی کو اپنا لیتے اور اگر ذرا ڈرپوک قسم کے ہوتے تو وہ داؤ لگنے پر اپنا شغل جاری رکھتے ورنہ دوسروں کو

جوار کھیلتے دیکھ کر خوش ہو لیتے۔

زین خان اور مدوضل بھی اسی قسم کے لوگوں میں شامل تھے۔ لیکن چونکہ ان کو شفیق کی یاری حاصل تھی اس لئے ان کا شوق ذرا زیادہ ہی چمکا ہوا تھا اور وہ اکثر سٹہ بازی اور گھوڑ دوڑ جیسے مشاغل سے بھی کبھی کبھار لطف اندوز ہو جایا کرتے تھے۔

شفیق نے کبھی ڈاکہ زنی اور راہ زنی میں تو زین خان اور مدوضل کا ساتھ نہ دیا تھا۔ لیکن ان کا چوری کیا ہوا مال وہ ضرور کچھ روز تک اپنے پاس امانت رکھواتا تھا کہ وہ دونوں اس کے جگری دوست تھے اور ان کی یہ دوستی اس روز سے اور بھی زیادہ گہری بلکہ پکی دوستی بن گئی جس روز خالق میر کی چھوٹی بہن شمادہ گم ہوئی تھی۔

بات یہ تھی کہ دس بارہ بجے صبح کا وقت ہو گا۔ شمادہ کے ایک ہاتھ میں سرسوں کے تیل کی بوتل تھی اور دوسرے ہاتھ میں فضل رحیم بنیوال کی ہٹی سے جھونگے میں مانگے ہوئے کالے چنے تھے جو وہ کھاتی ہوئی گھر کی طرف جا رہی تھی۔

شمادہ چار پانچ سال کی ننھی سی پیاری سی بچی تھی، وہ چھینٹ کی شلوار اور کورے ململ کی نیلے رنگ کی قمیض پہنے ہوئے تھی۔ وہ ابھی اپنے گھر سے ذرا دور تھی کہ مدوضل کی نظر اس پر پڑی۔ مدوضل نے اُسے اپنے پاس بڑے پیار سے بلایا۔

"میٹھی گولیاں کھاؤ گی؟" شمادہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آؤ لے لو—" مدوضل نے سر کے اشارے سے بلایا اور اپنی جیب میں یوں ہاتھ ڈالا جیسے وہ جیب سے گولیاں نکال کر دینے لگا ہو۔ اس نے نظر بچا کر آس پاس بھی چار کھی تھیں کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔

شمادہ ذرا جھجکی لیکن مدوضل نے اُسے پھر حوصلہ دلایا۔

"آؤ نا! لے لو۔ یہ دیکھو میری جیب میں ہیں"

اور شمادہ جب ذرا قریب آئی تو اس نے جھوٹی حیرانی سے جیب سے خالی ہاتھ نکالا۔

"اوئی بیج! وہ تو میری چارپائی کے سرہانے رکھی ہیں۔ کل ہی میں تمہارے لئے لایا تھا۔ آؤ میرے ساتھ۔ اور وہاں تمہارے واسطے ایک پیاری سی گڑیا بھی شہر سے لایا ہوں۔ بالکل تمہارے جیسی ہے! لو گی؟"

اور وہ شمادہ کو بہلا پھسلا کر گھر لے گیا۔ مدّوضل کی ماں گھر پر موجود تھی، وہ ابھی ابھی گھر کے دروازے کے ساتھ بنی ہوئی تندوری سے پکی ہوئی روٹیاں چنگیر میں ڈالے ہاتھ میں مٹی کی آٹا رکھنے کی تلفی رکھے پلٹ رہی تھی۔ اس نے جب شرماتی لجاتی شمادہ کو مدّوضل کے ساتھ دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ جانتی تھی کہ پرسوں چوتھ ہی مدّوضل اور خالق میر کی جھڑپ ہوئی تھی۔ وجہ نزع یہی کبوتر بازی تھی۔ مدّوضل کی کبوتری جو وہ کہیں سے اڑا کر لایا تھا۔ خالق میر کے کبوتر کے ساتھ، اڑان میں جوڑا ہو کر چلی گئی تھی۔ جس کا اس نے خالق میر سے واپسی کا تقاضا کیا۔ لیکن اس نے دینے سے انکار کیا۔ اور جب بات بڑھ کر گلی محلے تک آئی اور لوگ بیچ بچاؤ کرنے لگے تو گاؤں کے دو تین آدمیوں نے مدّوضل ہی کو لعنت ملامت کی۔ ان میں سے ایک پرانے کبوتر باز نے کہا۔

"تمہاری کبوتری کبوتر کے ساتھ خود اڑ کر آئی ہے۔ اب تم کیسے اس کے مالک بن رہے ہو؟ یہی تو اس کھیل کے داؤ پیچ ہیں۔ تم تو اس قانون سے واقف ہو۔ اب وہ خالق میر کی ہو چکی۔ اگر خالق میر کا کبوتر یا کبوتری تمہارے پاس خود اپنی مرضی سے آجاتی تو اس

کے مالک تم ہوتے۔ اب تو وہ خالق میر کی ملکیت ہے۔ کیونکہ اس کے قبضے میں ہے۔"

اور مدوضل اس وقت تو خاموش ہو کر واپس آگیا۔ لیکن اب اس وقت خالق میر کی چھوٹی بہن شمادہ اس کے قبضے میں تھی۔ ماں نے بڑا سمجھایا۔ خدا رسول کے واسطے دیئے، شور مچانے کی دھمکی دی لیکن مدوضل نے پستول دکھا کر ماں کو دوسرے کمرے میں لے جا کر بند کر دیا۔ اس نے اندر بہیترا شور مچایا۔ بغیر روشندان اور بغیر کھڑکی کے کمرے سے اس کی آواز باہر کہا جا سکتی تھی۔ دروازہ بھی مضبوط تھا۔ ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔

لیکن ——— شمادہ کی گردن اتنی مضبوط نہ تھی۔ جو ٹوٹ نہ سکتی۔ اس کی گردن تو اسی وقت ڈھلک گئی تھی۔ جب مدوضل کی سرخ انگارہ آنکھیں معصوم ننھی شمادہ کے سفید بلوریں ننگے جسم کے آر پار گزریں اور وہ اس کی درندگی کا شکار ہو کر خون میں لت پت بے کرشہ زمین پر ڈھیر ہو گئی۔

مگر اس کا جذبۂ انتقام ابھی کہاں ٹھنڈا ہوا تھا کہ اس کی کبوتری ابھی تک خالق میر کے قبضہ میں تھی اور جس کے پَر اس نے باندھ رکھے تھے۔ لیکن شمادہ کے پَر باندھے نہ گئے بلکہ اس کے بازو، ٹانگیں اور سر ایک ایک کر کے اس کے جسم سے علیحدہ کر دیئے گئے اور پھر اس شقی القلب نے ماں کے پیچھے بند کیا ہوا دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں وہی پستول تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ ماں کو آہستہ آہستہ پستول کے تلے اس کمرے تک لے آیا، جس میں شمادہ کے ٹکڑے پڑے تھے۔ کمرہ تاریک تھا، لیکن چند ہی لمحے بعد سرخ سرخ خون نے سارا عقدہ کھول دیا۔

"جلدی سے یہ ٹکڑے اٹھا کر اس بوری میں ڈال دو۔ سوا لاؤ اور سیئو اس بوری کو ——"

اس کی ماں تڑپ گئی "مجھ سے یہ نہ ہوگا۔"

"جلدی سے —— وقت ضائع مت کرو۔"

مدّو فضل ہنکارا "تم نہیں سیئو گی یہ بوری؟

تم، کیا تمہارے اس خصم خالق میر کی ماں آکر سیئے گی۔ ہاں بہت جلد یہ موقع بھی ہاتھ آجائے گا کہ اپنے بیٹے کی بوٹیوں سے بھری بوری اس فاحشہ سے سِلواؤں! —— اب تم دیر مت کرو! اس کو ٹھکانے بھی لگانا ہے اور تمہیں کو فی الحال سینا ہے۔"

اور اس طرح خالق میر کی بہن شمادہ فضل رحیم کی ہٹی سے واپس گھر نہ پہنچ سکی۔ تمام گاؤں میں اس کی گمشدگی کی ڈھنڈیا پٹی۔ آس پاس کی فصلیں چھان لی گئیں۔ تھانے تک میں گاؤں کے رپٹی نے رپورٹ لکھوادی کسی پر بھی دعویٰ دائر نہیں کیا گیا کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ شمادہ یوں ایک کبوتری کی بھینٹ چڑھے گی۔

اس واقعہ کے اگلے ہی روز شمادہ کی ماں کی ذرا کی ذرا جو آنکھ جھپکی۔ تو بیٹی اس سے مخاطب تھی۔

"ماں! میں رو رہی ہوں اور تم سو رہی ہو! دیکھو مجھے کتنا بڑا سینگ لگا ہے ...."

"کیسا سینگ؟ کس نے مارا سینگ!" ماں نے گھبرا کر پوچھا۔

لیکن معصوم شمادہ پر خوف طاری تھا وہ دہشت کے مارے کچھ نہ بتا سکی۔ ماں گھبرا کر اٹھ بیٹھی، جب اس نے یہ واقعہ سنایا تو سب نے یہی سمجھا کہ یہ اس کا واہمہ ہے۔ لیکن یہ معمہ کوئی حل نہیں کر سکتا تھا کہ

شمادہ گئی تو آخر گئی کہاں۔

اور شمادہ نے پھر سوتے میں ماں سے کہا۔

"ماں !! مجھے لکھول کے اندھے کنوئیں سے بہت ڈر لگ رہا ہے مجھے نکالو نا۔۔۔۔۔۔۔"

اور اس کے ساتھ ہی ماں پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے چیخنا چلانا شروع کیا۔ آخر کو ماں تھی، سچا خواب بھی دیکھ سکتی تھی۔ چنانچہ تین چار روز بعد شمادہ کے ٹکڑے بوری میں بند لکھول کے اندھے کنوئیں سے بڑی مشکلوں سے نکالے گئے۔

لکھول کا یہ اندھا کنواں بڑا مشہور کنواں تھا۔ کسی زمانے میں لکھول خان نامی کسی شخص نے یہ کھدوایا تھا اور اس سے گاؤں کو پانی مہیا ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ ویران پڑا تھا۔ گاؤں کے شریر بچے بالے، بلیاں، کتے یا ان کے بچے اس میں پھینکا کرتے تھے۔ بے زبان چند روز تک روتے رہتے لیکن ان کو زندہ نکالنے کے لئے کسی کے پاس اتنا وقت نہ تھا۔ پھر چپ ہو کر مرکھپ جاتے۔ سڑاند کی بو راہگیروں کا پیچھا کرتی رہتی، لوگ باگ بد دعائیں دیتے رہتے۔ پھر آہستے آہستے بدبو ختم ہو جاتی اور لوگ بھول جاتے۔

اور پھر شمادہ کا قصہ بھی لوگ آہستہ آہستہ بھول گئے۔ کہتے ہیں جرم کبھی بھی چھپائے نہیں چھپتا ایک نہ ایک دن خود ہی بول اٹھتا ہے لیکن مدوضل کا اتنا بڑا جرم شفیق نے چھپالیا۔ گاؤں میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ یہ کام مدوضل کے علاوہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ لیکن شفیق نے کہنے والوں کا منہ یہ کہہ کر بند کرا دیا تھا کہ مدوضل کو اس نے اس واقعہ سے ایک روز قبل ہی کسی کام سے لاہور بھیجا تھا اور اس طرح بظاہر وہ لوگوں کے ذہن سے نکل گیا۔ شمادہ کی ماں اور بھائی

بھی خاموش رہے۔

اور اس دن — مدو ضل اتنے بڑے احسان کے بدلے میں شفیق کا ایک قسم کا زر خرید غلام بن گیا تھا۔

مدو ضل آنا دکھائی دیا۔ شفیق اس کے ہاتھ میں خلاف معمول اخبار دیکھ کر چونک گیا۔ اس کے دل میں گذری "اخبار والوں کو بھی خبر ہو گئی کیا!" اس نے اپنے پورے وجود میں خوف کی اک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ لیکن جب مدو ضل نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ جس سے اخبار میں کسی اہم خبر کے چھپ جانے کا اندازہ ہو سکتا، تو وہ مطمئن ہو گیا۔

"چھوڑ دیا صرف نئی فلم کا اشتہار دکھانے اپنے پیسے خرچ کر دیئے وہ تو ہم سے پوچھو پورے پاکستان کے سینماؤں کا بتا دوں کہ کس سینما میں کونسی فلم چل رہی ہے۔"

زین خان نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بڑے ٹھسے سے کہا۔

فلموں کے اشتہار دیکھنے کے لئے جونہی شفیق نے مدو ضل سے اخبار چھینا، اس کی نظر پہلے ہی صفحے پر دیئے گئے ایف۔ اے کے ریزلٹ پر پڑی، وہ سب باتیں بھول کر جلدی سے ریزلٹ دیکھنے لگا۔ اسے نام اور رول نمبر تو نظر نہ پڑے۔ لیکن پرائیویٹ طلباءً اور طالبات کی فہرست زیب النساء عنایت کے نام پر اس کی نظر اٹک کر رہ گئی۔ وہ حیرت کے مارے آنکھیں پھاڑے اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھنے کے ساتھ ہی حجرے سے ہوتا ہوا گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ جب وہ دوڑتا ہوا جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بہن ہدایتہ بچوں سمیت ان کے گھر سے نکل کر اپنے گھر کو جا رہی تھی۔ وہ اتنی تیزی میں تھا کہ بہن سے وہ سرسری سا استڑے مشے بھی ٹھیک طور سے نہ کر سکا۔ ہدایتہ تھوڑی دیر کو ٹھٹکی، پھر سر کو جھٹکا دے کر سفید برقعے کا نقاب منہ پر گرایا اور یہ کہتے ہوئے

آگے بڑھی۔

"شفیق بندے! اتنے بڑے ہو گئے۔ لیکن وہی جانور کے جانور ہی رہے تم نے ماں باپ کی کبھی عزت کی ہو تو ہم بہنیں بھی تم سے کوئی توقع رکھیں؟ چلو بھائی وہ ہم پشتو میں کیا کہتے ہیں کہ سلامت رہو۔ دشمن کی آنکھوں کے خار رہو۔" ہدایتہ نے دل ہی دل میں یہ کہا۔

شفیق بھاگتا ہوا گھر میں گھسا، صحن میں مٹی کا کوزہ پانی سے بھرا پڑا تھا اس کے ساتھ ٹھوکر کھائی اور غصے میں ایک پیر سے فٹ بال کی طرح ہوا میں اچھال کر اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ گل شافیہ جو ابھی ابھی بیٹی اور نواسوں کو گھر سے رخصت کر کے دالان کی طرف بڑھ رہی تھی اس کی آواز سے چوکنا ہو گئی۔

"ماں!! ماں! ماں کہاں ہو؟" وہ چیختا چلاتا، منہ سے جھاگ نکالتا دھاڑتا ہوا آگے بڑھا چلا آ رہا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟ خیریت تو ہے!" ماں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ دیکھو، یہ اخبار، اس میں تمہارے اس خان عنایت اللہ خان کی نورِ چشم کا نام لکھا ہے۔"

"ہائے اللہ، اخبار میں نام کیسا لکھا آیا۔ ہاں ہاں پڑھائی کے بہانے پرائے گھر رہ رہی تھی! کوئی کرتوت تو کر کے دکھانے تھے نا کیا لکھا ہے اخبار میں؟ اسی ڈاکٹر کے اس جواں مرگ بیٹے کے ساتھ بھاگی ہو گی منہ کالا کر کے۔"

گل شافیہ جب یہ گل افشانیاں کر رہی تھی تو اب کے ایک ایک لفظ سے طنز کے تیر برس رہے تھے۔

"ہاں کل کلاں یہ بھی اخباروں میں لکھا دیکھ لوگی۔ بے غیرت، بے حیا لوگ ہیں۔ نہ خود شرم آتی ہے، نہ دوسروں کی عزت کا خیال رکھتے

ہیں۔ قسم ہے پاک رب کی۔ اگر میرے ساتھ منسوب نہ ہوتی تو جرون
میں نچواتے تا تو بھی ذرا بھر افسوس نہ ہوتا۔ بلکہ میں بھی ایک تماشائی
بن کر تماشے دیکھا کرتا۔"
شفیق بے طرح دھاڑ رہا تھا۔ ماں نے بیٹے سے اخبار لے
کر دیکھنا شروع کیا۔
"نام کے ساتھ تو اس کہ فوٹو بھی چھپی ہو گا۔ کدھر ہے۔
بتاؤ ذرا؟"
"ادھر دو اخبار جاہل عورت! اخبار پکڑنا بھی نہیں آتا۔ الٹا پکڑا ہوا
ہے یہ دیکھو یہ ہے بڑے کارنامے کے ساتھ مس صاحبہ کا نام۔۔۔
زیب النسا عنایت۔"
شفیق نے ماں کے ہاتھ سے اخبار اس زور سے چھینا کہ آدھا صفحہ
گل شافیہ کے ہاتھ میں رہ گیا۔
"آگ لگے اس نام کو، جواں مرگ، آخر لکھا کیا ہے۔ مینمی کے
نام کے ساتھ۔ تم پڑھ کر سنا دو نا، میں کیا جانوں کیا لکھا ہے؟"
اس اخبار میں بارھویں کا نتیجہ چھپا ہے اور پرائیویٹ امیدواروں کی
فہرست میں زیبو کا نام بھی دیا ہے۔ پاس ہو گئی ہے۔"
"اور تم۔۔۔؟" ماں نے مختصراً سا پوچھا۔
"اُف اب تم مزید نمک مت چھڑکو امیری تو مت ماری گئی ہے۔
جانے کیا ہو جاتا ہے۔ اس بار بھی نہ نکل سکا۔"
شفیق یکدم کھڑا ہوا اور سر کو اِدھر اُدھر جھٹکے دینے لگا۔
"ہاں بیٹے چالاک لوگ ہیں، ہر قسم کے ہتھکنڈے جانتے ہیں۔ کسی کو
رشوت وغیرہ دے دلا کر پاس کرا لیا ہوگا۔ اس کم بخت سے کہتی رہی کہ
دیکھو تم بھی بیٹے کی خاطر کچھ ہاتھ پیر مارو، کسی کو کچھ دو دلاؤ، لیکن تمہارا

باپ وہ کنجوس مکھی چوس ہے کہ الامان اور کچھ نہیں تو کم از کم اس تمہارے بڈھے سُسرے کی آنکھوں میں تو دھول جھونکی جا سکتی تھی اور وہ تیرے ساتھ اس نصیبو پھوٹی زہرو کی شادی پر رضا مند ہو جاتا۔"

"میں تو کہوں ماں اس نیک بی بی کا نام میرے سامنے مت لو بیماریوں کا گڑھ ہے۔ اس میں آخر رکھا ہی کیا ہے؟ حور شمائل ہے! کیا ہے آخر؟ مجھ میں اس بے غیرتی کو اور برداشت کرنے کی طاقت نہیں رہی ماں۔"

"ایسا مت کہو بیٹے!" ماں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

ایسا کیوں نہ کہوں؟ جوان جہان لڑکی پرائے گھر رہ رہی ہے۔ کون ہوتے ہیں وہ لوگ اس کے منگیتر میری ہے۔ آخر کو دو لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہوں حجرہ چل رہا ہے میرا، یار دوست رکھتا ہوں، کیا سمجھیں گے مجھے یہ سب لوگ؟ بے غیرت نا!!"

"چھوڑ دو بیٹے! کیوں منہ کھلواتے ہو، جانتی ہوں تیرے ان تیار خوار دوستوں کو"

"دیکھ ماں منہ سنبھال کے بات کیا کر! میرے دوستوں کے بارے میں ذرا بھی غلط بات دوبارہ منہ سے نکالی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ باپ سے بھی میری اس بات پر نہیں بنتی صرف تم ہی لوگوں کا نہیں کھاتے، میں بھی لاتا ہوں کما کر کچھ نہ کچھ اس گھر میں۔"

"برا مت مانو، مگر تمہاری اس کمائی سے ہماری جمع جتھا آہستہ آہستہ صدقے ہو رہی ہے۔ یہ تو شکر کر کہ باپ دادا کی کچھ زمین تھی ورنہ ہم تو بھوکوں مرتے۔"

"اس باپ کا میں بھی بیٹا ہوں، اور اسی دادا کا پوتا بھی ہوں جس کی جائیداد کا تم مجھے طعنہ دے رہی ہو۔ پورا حق دار ہوں، رہ گئی میری

کمائی تو دو، دن بھی آنے والا ہے جب تم فخر کیا کرو گی کہ میرے جگر کے ٹکڑے کی موٹریں ہیں۔ جائدادیں ہیں۔ زمینیں ہیں اور . . . . .“

”میرے نصیب اتنے اچھے کہاں ہیں، جو یہ دن دیکھوں گی اور اس گھر میں زیبو آئے گی اور ساتھ ہی عنایت کی تمام دھن دولت اس گھر کی ہو جائے گی۔“

”ماں! اس زیبو سے میرا پیچھا چھڑا نہیں سکتی ہو؟ وہ مجھے بہت بری لگنے لگی ہے۔“

”نا بیٹا ایسا مت کہو اور ہاں اگر تم کو بری لگتی ہے تو ٹھیک ہے ایک بار وہ اس گھر میں بہو بن کر آ جائے تو دوسرے دن ہی تمہاری شادی کہیں اور نہ کر دی تو پھر . . . . . .“

”تو پھر تمہارا نام بھی گل شافیہ نہ ہوگا۔“ بیٹے نے ماں کی بات کاٹ کر کہا۔

”اچھا اب اٹھو اور ایک فرمانبردار ماں کی طرح سیدھے سبھاؤ نکالو سو سو کے ایک پانچ لال بابا۔“

”دیکھو شفیق تنگ مت کرو، قسم لے لو جو . . . . .“

”نا نا جھوٹی قسمیں مت کھاؤ! مجھے معلوم ہے کہ چابیاں کہاں رکھتی ہو؟ لیکن چوری نہیں کرتا، پھر کاروبار میں برکت نہیں ہوگی، اٹھو، جلدی سے دے دو، کسی کو کاروبار کے سلسلے میں رشوت دینی ہے، وہ سیانے کیا کہہ گئے ہیں کہ سو کھلاؤ ہزار کماؤ، جلد واپس دے دوں گا، بس تم اب مدد کرو ذرا اور دعائیں بھی دو، ہاں سچ میں رات کو نہیں آؤں گا۔ انتظار مت کرنا۔“

شفیق ماں سے پیسے وصول کر کے باہر نکل آیا۔ وہ اب اخبار اور ریزلٹ والی بات بھول گیا تھا۔ حجرے میں زین خان اور مدو خان اس کا انتظا

کر رہے تھے۔ وہ سب جس مہم پر روانہ ہونے والے تھے اس کی ایک کڑی وہ چند روز ہوئے سر کر چکے تھے۔ اب کاروبار کو مزید آگے بڑھانے کے لیے انہیں پیسوں کی ضرورت پڑی تھی۔ شفیق کے پاس کچھ رقم اپنی تھی کچھ اس نے ماں سے ہتھیا لی۔

شام ہونے والی تھی۔ تینوں دوست شفیق کے حجرے میں چائے پی کر رات ہونے سے پہلے پہلے شہر کی طرف جانے والی سڑک پر روانہ ہوئے۔ شہر سے سواری کا بندوبست کرکے جرنیلی سڑک پر ہو لیے اور لنڈی کوتل کے راستے تورخم پہنچ گئے۔ وہاں چند اور لوگ ان کے منتظر تھے اور پھر رات کی تاریکی میں وہ پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔

گرمیوں کی ایک تپتی سہ پہر تھی۔ اگست کا مہینہ تھا۔ ایف اے کا نتیجہ نکل آیا تھا۔ زیبو نے سیکنڈ ڈویژن لے لی تھی۔ وہ ان دنوں پڑھائی سے فارغ تھی اور اپنے گھر آ چکی تھی۔ وہ افروزہ کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ابھی ابھی دونوں اپنے باغ کی ایک ایک ناشپاتی اور آڑو کھا کر فارغ ہوئی تھیں۔

زیبو نے کہیں پڑھا تھا کہ ناشپاتی کھانے سے دل کو تقویت ملتی ہے اور قلبی امراض حملہ نہیں کرتے، لیکن اسے آڑو زیادہ پسند تھے اور بڑی رغبت سے کھایا کرتی تھی۔ سردی کے پھلوں میں سنگترہ بڑے شوق سے کھاتی تھی۔ اس کی پسند کو دیکھتے ہوئے اس کے باپ نے کینو کے کئی پودے بھی لگا دیئے تھے کہ ان کا ذائقہ بھی سنگترے سے کچھ ملتا جلتا سا ہوتا ہے۔ عنایت بیٹی کی پسند کو مقدم رکھتے تھے، جس کی بنا پر باپ بیٹی ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے تھے اور جو فخر ایک پشتون باپ اپنے بیٹے پر کرتا ہے۔ وہی اسے زیبو پر حاصل تھا کہ وہ اس کی توقعات پر پوری اتر رہی تھی۔

افروزہ نے باقی پھل اٹھالئے تھے۔ ناشپاتی اور آڑو کے بیج دروازے کے ساتھ رکھے ٹین کے ڈبے میں ڈال دیے تھے۔ یہ اور اس طرح کے بے شمار روغن کئے خالی ڈبے اس گھر کے مختلف حصوں میں کوڑا کرکٹ جمع کرنے کے لئے رکھے گئے تھے۔ بیٹھنے کے کمرے میں بھی اس قسم کا ایک ڈبہ رکھا تھا۔ لیکن اس پر کسی رسالے کا پھاڑا ہوا رنگین سینری کا کاغذ لپٹا ہوا تھا اور جاوید نے اس کی ایک بار بہت تعریف کی تھی۔

افروزہ اور زیبو مختلف موضوعات پر بات چیت کر چکی تھیں۔ افروزہ بڑے دنوں سے ایک اہم بات پوچھنے والی تھی وہ موقعہ کی تلاش میں تھی اور آج اسے موقعہ مل ہی گیا۔ وہ ہنستے ہوئے مزاحیہ انداز اختیار کر کے حرف مدعا آخر لبوں پر لے ہی آئی۔

"زیب النساء بیگم بی بی! میں تو قطعی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ "جاوید ولا" اس لئے واپس نہیں جاتیں کہ جاوید خان نے آپ کے ساتھ بڑی محنت کی تھی اور آپ سینٹ ڈویژن نہ لے سکیں۔"

"تو تم مت مانو نا۔" زیبو نے مختصراً کہا۔

"تم اتنی آسانی سے تو مجھ سے جان نہیں چھڑا سکتیں۔ میں تمہاری بچپن کی سہیلی ہوں۔ شکر ہے تم ماں باپ کے سائے تلے پل رہی ہو۔ میں یتیمی کے تھپیڑے کھا کر پلی پڑھی ہوں، ماں سے بھی چچا نے نکاح پڑھوا کر اسے ہم سے چھین لیا۔ وہ بھنگ، چرس کا عادی ہے، روز روز کی مار دھاڑ سے ہماری ماں بیچاری اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو چکی ہے۔ وہ ہم کو کیا اپنا سمجھے گی؟ باقی کی کہانی تو تم خود ہی جانتی ہو، تو ایسے حالات میں پلی بڑھی لڑکی کے مقابلے میں زیبو جان! تمہارا کیا تجربہ ہوگا۔ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ جان چھڑانا فضول ہے اور سب کچھ سیدھے سیدھے بتاؤ؟"

"ہاں جانتی ہوں، جہاں دیدہ ہو، ہوشیار ہو، تعلیم یافتہ ہو، لیکن

کوئی بات ہو تو بتاؤ ناں۔"

زیبو نے واقعی جان چھڑانے کے لئے کہا تھا۔

"سچ سچ بتاؤ تم ڈاکٹر صاحب کے گھر جانے اور مزید پڑھنے سے کیوں انکار کر رہی ہو؟"

اس پر زیبو چپ رہی ـــــــ

"بتاؤ نا! کیوں واپس جانا نہیں چاہتی جاوید ولا۔"

"خدا کے واسطے مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

زیبو یکدم سنجیدہ ہوگئی تھی۔

"مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔"

"کیسی حالت؟ جب نہیں دیکھی جاتی تو جو جی میں آئے کرو۔ لیکن مجھے بخشو! جاؤ اٹھو دفعان ہو یہاں سے۔"

"میرا تو جی یہ چاہتا ہے کہ جیسی تم ہو، ویسا تمہارا جیون ساتھی بھی ہو، لائق، ذہین اور ـــــــ اور خوبصورت گبھرو جوان۔ جیسے جیسے جاوید خان"۔

افروزہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ یہ سنتے ہی زیبو کو جیسے بچھو نے ڈنگ مارا ہو، فوراً اپنی جگہ سے اُچھلی، دو چار قدم لئے، اور پھر جیسے نزع کی حالت میں سے گزر رہی ہو۔ اس کے ہونٹ بڑی مشکل سے وا ہوئے۔

"اس طرح کہنے سے بہتر تھا کہ زہر لا کر دے دیتی لیکن ـــ لیکن ـــ لیکن یہ تم نے کیا کہا؟

اور اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔

"اب تو ان آنسوؤں نے بھی دل کا بھید کھول دیا ہے۔ اب کاہے کو بات چھپاتی ہو؟"

افروزہ اپنی جگہ جوں کی توں بیٹھی رہی۔
"جب بھید جان ہی چکی ہو! تو اب کیوں مزید ستاتی ہو۔ بس چپ کرو آگے کچھ مت بولو۔"
"میں تم سے اب کچھ نہ بولوں گی۔ بڑی بی بی کو کریم خان کے چچا کے گھر سے آ لینے دو۔ تمام بات اب ان کو پہنچاؤں گی۔ چاہے گھر سے دھکے دے کر ہی کیوں نہ نکالی جاؤں۔ تمہاری خاطر ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔"
افروزہ نے بڑے حوصلے سے کہا۔ زیبو آنسوؤں میں مسکرائی۔
"تمہارے حوصلے، جرأت اور عظیم قربانی کے جذبے کی قدر کرتی ہوں مگر۔ مگر دیکھونا ۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔"
"اگر مگر کچھ نہیں۔ اب کھل کر بات کرو، یہی تو وقت ہے جب تم مجھے آزمائش میں ڈال سکتی ہو۔ دیکھو تمہاری نوکرانی افروزہ تمہارے لئے کیا کرتی ہے۔"
زیبو کچھ دیر خاموش رہی! پھر جیسے وہ اپنے حال میں نہیں رہی تھی کسی اور دنیا سے بول رہی تھی۔
"افروزہ تم یک طرفہ پیار کی قائل ہو؟"
"یعنی جب ایک پیار کرتا ہو، مگر وہ دوسرا جوابا" پیار نہ کرتا ہو؟"
"ہاں!"
"نہیں ۔ میں ایسے پیار کی قطعی قائل نہیں ہو سکتی۔"
"لیکن میرا معاملہ ایسا ہی سمجھو۔"
زیبو نے دھیرے سے کہا۔
"یا تو وہ بن رہا ہے یا پھر اس کے من میں کوئی اور سمایا ہوا ہے"
اس پر افروزہ بولی۔

تھوڑی دیر کو دونوں طرف سے خاموشی رہی۔ پھر بڑی مشکل سے زیبو کے ہونٹ ہلے۔

"میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے ورنہ ــــ"

وہ چپ ہو گئی، افروزہ بڑے غور سے زیبو کو دیکھ رہی تھی۔

"تم کیسا محسوس کرتی ہو، جب اس کے قریب ہوتی ہو۔ تمہارا دل زور زور سے دھڑکا کرتا ہے؟"

"میں یقین سے کہہ بھی تو نہیں سکتی کہ "ہاں" اور انکار کا بھی یارا نہیں ــــــ میں تو ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پاتی ہوں کہ اس نے میرے دل میں جگہ کر لی ہے۔ بس مجھے بے انتہا اچھا لگتا ہے۔"

"اسی کو تو پیار کہتے ہیں نا؟"

افروزہ نے اپنی علمیت جتلائی۔

"میرے دل میں اس کی اتنی قدر و منزلت ہے میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ جو بات وہ میرے لئے کہہ دے اور جس طرح میرے بارے میں سوچے اس کے اس پیمانے پر میں پوری اتروں۔"

زیبو اپنی دھن میں کہی جا رہی تھی۔

افروزہ نے پھر اپنی معلومات بہم پہنچائیں۔

"اور یہی تو محبت کی علامات ہوتی ہیں۔"

زیبو خلاؤں میں گھورتے ہوئے اسی سے بولتی گئی۔

"اور یہ کہ ایک لڑکی کا جو آئیڈیل ہوا کرتا ہے۔ بس اس پر وہ پورا پورا اترا ہے۔"

"پگلی اسی کو تو من کا دیوتا کہا جاتا ہے نا۔"

"لیکن میں جو اس کے دل کے حال سے واقف نہیں ہوں۔ اس نے کبھی بھی کچھ جتلایا تو نہیں۔"

زیبو نے بڑی ہی گمبھیرتا سے کہا۔

"تم نے کبھی کوئی ایسی بات چھیڑی ہے اور ہاں، شفیق خاں کے ساتھ اپنی نسبت کی بات کبھی اس سے کی ہے؟" افروزہ نے اچانک پوچھ مارا۔

"میں کیسے بتاتی؟"

"اب کے جب جاؤ، تو باتوں باتوں میں ضرور ذکر چھیڑ دینا۔ پھر دیکھو اس کا رویہ کیا ہے، بس خود اندازہ لگا لو گی۔"

افروزہ نے سمجھانے کے انداز میں زیبو سے کہا۔

"شاید بے بے اور داجی نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر ڈاکٹر چچا اور چچی سے یہ بات چھپا رکھی ہو۔ کیونکہ آج تک ان لوگوں کی ایک بات سے بھی مجھے یہ شک نہیں گزرا کہ وہ میری ٹھیکرے کی منگنی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔

افروزہ نے ایک اور پینترا بدلا۔

"اب کے جب میں تمہارے ساتھ جاؤں تو میں بتا دوں؟"

"ہائے، نہیں، ایسا غضب مت ڈھانا ــــــ"

کیوں؟ نمبر گھٹ جائیں گے؟"

"نہیں بھئی، دیکھو نا! پھر میں آنکھ کیسے ملاؤں گی۔"

"کس سے، جاوید خان سے"

"نہیں بھئی، سب سے۔"

"کیوں بے خبر رکھنا چاہتی ہو؟"

افروزہ نے رسان سے پوچھا۔

"یہ میرا کام نہیں ہے۔ اگر میرے ماں باپ نہیں چاہتے کہ ان کو پتہ چلے تو...."

"تم بھی یہی چاہتی ہو کر وہ غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔"

"ان کی غلطی فہمی، میری خوش فہمی ہے اور میں، تمام عمر جان بوجھ اس خوش فہمی کا شکار رہنا پسند کرتی ہوں سمجھی اب!"

"اس کا فائدہ؟"

"مجھے نہیں معلوم، میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ اب اگر داجی نے بھی کبھی حالات سے شکست کھا کر شفیق کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا تو میں صاف انکار کر دوں گی اور تب تک بیٹھی رہوں گی، جب تک شفیق دوسری جگہ شادی نہیں کر لیتا۔"

"اور اس کے بعد؟"

افروزہ نے پوچھا۔۔۔۔۔

"پتہ نہیں، اس کے بعد کیا ہوگا؟"

زیبو نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

"پڑھائی کے سلسلے میں "جاوید ولا" جا رہی ہو؟"

"نہیں"

"آگے پڑھنا نہیں چاہتیں؟"

افروزہ نے کریدا۔

آگے پڑھوں گی، لیکن کالج میں داخلہ لوں گی۔"

زیبو نے دبی ہوئی آہ کے ساتھ کہا۔

"یوں کیوں نہیں کر لیتیں کہ تیرھویں اور چودھویں کا امتحان پچھلے امتحان کی طرح اکٹھا دو، جاوید خان سے مدد لیتی رہو، اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

اب تو وہ بھی گھر پر نہیں ہوں گے۔"

زیبو نے جاوید کا نام لئے بغیر کہا۔

"کیوں؟ کہاں جائے گا؟"

افروزہ نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔

"میڈیکل میں اچھے نمبر آئے تھے۔ فوج میں کمیشن مل گیا ہے"

زیبو نے اداس لہجے میں بتایا۔ اس پر افروزہ برجستہ بولی۔

"تب ہی چند روز سے بجھا بجھا سا نظر آتا ہے۔ بیچ میں یہ بات نکل آئی۔ جدائی کے غم کے مارے اداس ہے"

"کیسی جدائی؟ کس کا غم؟ اے لڑکی تو نے تو واقعی سب کچھ سچ سمجھا، ارے میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔"

زیبو گھبرا گئی۔

یعنی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"

افروزہ ترنگ میں بولتی گئی۔

"یہ کیا غلیظ غلیظ فلمی ڈائیلاگ بولنے لگی ہو؟ میں نے تو اپنے دل میں ابھی یہ فیصلہ بھی نہیں کیا ہے کہ وہ مجھے یونہی اچھا لگتا ہے یا واقعی.........."

"یا واقعی اُسے دل دے بیٹھی ہو؟" افروزہ نے زیبو کا ادھورا جملہ پورا کیا۔

"کیا تم خاموش نہیں رہ سکتیں؟" زیبو کو واقعی غصہ آ گیا تھا۔

"خاموش تو تم رہو کر خاموش آگ میں جل رہی ہو" افروزہ کہے جا رہی تھی۔

"خدا کے لئے آگے کچھ مت بولو" زیبو روہانسی ہو گئی۔ لیکن افروزہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

"تو کیا یہ جھوٹ ہے"

افروزہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"دیکھو، میں رو پڑوں گی اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو ــــ"

"چلو، ایسا کرتے ہیں کہ تم اپنا دل ٹٹولو اور دیکھو وہ کہاں تشریف فرما ہیں اور دوسری طرف سے میں تم کو ڈھونڈوں گی کہ جناب کے دل کے کونسے گوشے میں چھپی بیٹھی ہو۔"

افروزہ پر مذاق اور سنجیدگی دونوں کیفیات طاری تھیں۔ اتنے میں زیبو کی نظر اپنی ماں پر پڑی، جو باہر صحن میں داخل ہو چکی تھی۔ انھوں نے برقعہ اتار دیا تھا اور ان کی ملازمہ کا بلئے ان سے برقعہ لے رہی تھی۔ وہ زیبو کو پوچھتے ہوئے اندر کمرے کی طرف مڑ کر آنے لگی زیبو جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گئی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور افروزہ جو تھوڑی دیر پہلے اتنی دلیر بن رہی تھی کہ زیبو کے دل کا چور پکڑ کر بڑی بی بی اور خان بابا کے ہاتھوں میں دینا چاہتی تھی، اب ڈری ہوئی بلّی کی طرح بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور دوڑتی ہوئی فارم کی طرف بھاگی ۔ زیبو نے بھی سکھ کا سانس لیا اور ماں کے استقبال کو آگے بڑھ کر ماموں کے گھر کا حال احوال معلوم کرنا شروع کیا۔

ستمبر کی ایک خنک شام تھی "جاوید ولا" کے لان اور درختوں پر خزاں کے آثار شروع ہو چکے تھے لیکن اس کے مکینوں کے دلوں میں بہار کی آمد آمد تھی۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ مسرور وشاداں تھے، ڈاکٹر کو اس بات کی خوشی تھی کہ اس کا جگری دوست عنایت خان اور اس کا گھرانہ اس کے اتنے قریب آچکے تھے کہ اب ہُما کو تنہائی کا احساس رہا ہی نہ تھا۔ دوسرے زیبو بھی قریباً مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی، جاوید بھی اب خاصا خوش تھا اور رعوب چھکا کرتا تھا۔

اُدھر عنایت کا خاندان اپنی جگہ پر مطمئن تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی زیبو کو خدا نے صحت دے دی، زیبو بھی اپنا گوہر مقصود پا چکی تھی، پڑھ رہی تھی اور آگے بڑھ رہی تھی۔

پندرہ وسولہ ستمبر کی درمیانی رات کو جاوید کی سالگرہ کا سہارا لے کر ہُما نے مہر النسأ کو اپنے ہاں ٹھہرایا ہوا تھا اور اب یہ کوئی نئی بات بھی نہیں رہی تھی۔ مہرو اکثر وبیشتر رات کو زیبو کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں ٹھہر جایا کرتی تھی۔

سب لوگ شام کو لان میں بیٹھے پورے دن کی مصروفیات کا تذکرہ کر رہے تھے۔ سولہ ستمبر کو جاوید کی سالگرہ منائی جانے والی تھی،

انتظامات سب مکمل تھے لیکن ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو وہ پوری کر دی جائے۔ چنانچہ ہر طرح سے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد سب مل کر شام کی چائے پی رہے تھے۔ عنایت کو شام کو گاؤں جانا تھا لیکن وہ فی الحال یہیں تھا۔ اچانک ہُما نے زیبو کو مخاطب کر کے کہا۔

"زیبو بیٹی، میں نے کہا تم سے ایک بات پوچھوں؟"

"کہئے چچی، کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟"

زیبو ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"پوچھنا یہ تھا کہ تم نے جو یہ اپنی ساری مُرغیاں انڈوں پر بٹھا کر بند کر دی ہیں، اچھا نہ تھا کہ INCUBATOR لگوا دیتیں، بجلی بھی گھر پر موجود ہے۔ فارم کی آمدنی اور بھی بڑھ سکتی تھی۔"

"ہاں دیکھو نا زیبو! تمہاری چچی کو کتنی دُور کی سُوجھی ہے۔ (INCUBATOR) "ان کوبٹیر" سے بچے بھی زیادہ نکلا کریں گے اور مُرغیاں بھی فارغ ہوں گی۔ انڈے دیں گی۔"

ڈاکٹر نے ہما کی بات دُہرائی۔ زیبو تھوڑی دیر خاموش رہی، پھر سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔

"آپ دونوں صحیح فرما رہے ہیں، لیکن اس طرح پھر چوزے بن ماں کے بڑے ہوں گے۔"

"لو، یہ سُنو، نئی منطق!" ڈاکٹر نے اس پر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے کہا۔

"بھئی جانوروں اور پھر مرغیوں کے کیا باپ اور کیا مائیں؟"

زیبو نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اپنی ماں! انسان ہو، مرغی ہو یا کوئی اور جانور، لیکن ماں، ماں

ہوتی ہے۔ اپنی ماں بچے کی جس طرح تربیت کرتی ہے، پرائی ماں کس طرح کر سکتی ہے؟"

جاوید جو پہلے جانے کن خیالوں میں گم تھا۔ یکدم چونکا۔ اس کو زیبو کے منہ سے ایسی باتیں سُن کر ایک دھچکا سا لگا اور اس کی دلچسپی اس قدر بڑھی کہ وہ کُرسی سے یکدم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

" تو تمہارا کیا خیال ہے؟ کہ ماں تمام عُمر اپنے بچوں کے ساتھ زندہ رہے؟"

" نہیں! نہ تو میرا اپنا یہ خیال ہے اور نہ ہی ایسا کہہ سکتی ہوں۔ یہ قدرت کے اپنے کھیل ہیں، کسی کی ماں زندہ رہتی ہے یا کسی کی ماں مر جاتی ہے۔ میں تو فطرت کی بات کر رہی ہوں"

زیبو نہایت سنجیدہ تھی۔

" تو تم سوچتی ہو کہ فطری قوانین کی روح سے ہر بچے کی پرورش کے لئے ماں کا موجود ہونا ضروری ہے؟"

جاوید اب پھر اپنی کُرسی پر آ بیٹھا تھا اور اپنے جسم میں ہلکے ہلکے جھٹکے سے محسوس کرنے لگا تھا۔

" اگر بات صرف پرورش کی حد تک ہو، تو پھر ہاں کوئی بھی عورت یہ فرض پورا کرنے کی اہل ہے۔ چاہے وہ اپنی ماں نہ بھی ہو، لیکن وہ یہ حق رکھتی ہے کہ اسے بھی ماں کہا جائے۔ لیکن میں صرف پرورش کی بات کر رہی ہوں۔ مگر جہاں تک انسانی بچے کا تعلق ہے تو پھر پرورش اور تربیت میں ہمیں ایک حدِ فاصل کھینچنی ہوگی۔ پرورش بچے کو زندہ رکھنا اور زندہ رہنے کے طریقے سکھاتا ہے۔ لیکن تربیت کا دائرہ انسان کی شخصیت کی تکمیل کی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔ پھر ان حالات میں اپنی ماں کی موجودگی بچے کے لئے اتنی ہی

اہم ہے جتنی جسم کے لئے روح یا آنکھ کے لئے بینائی۔"

زیبو اپنی بات پوری کرنے کے بعد سب کے چہروں کو باری باری دیکھنے لگی تھی۔ ماحول پر تھوڑی دیر کے لئے خاموشی نے اپنا باریک سا پردہ کھینچ دیا تھا اور اس پردے کے پیچھے سب لوگ زیبو کی باتوں کو سن کر دل ہی دل میں اس بظاہر خاموش طبع لیکن ذہین لڑکی کی عقل کو داد دے رہے تھے۔ ڈاکٹر جو زیبو کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔

"اچھا تو تم ان بچوں کے متعلق کیا رائے رکھتی ہو؟ جن کی اپنی مائیں یا تو مر چکی ہوں یا حالات نے ان کو ان سے جدا کر دیا ہو، اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"یہ تو آپ مانتے ہیں نا کہ ایسے بچوں کی شخصیت اگر تکمیل کے تمام مراحل طے کر بھی چکے تو محرومی کا احساس ساری عمر دامن گیر رہتا ہے اور یہ اس لئے کہ فطرت اس بات کی متقاضی ہے۔"

زیبو نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ڈاکٹر زیبو کی یہ دلیل سُن کر تھوڑی دیر خاموش رہا پھر گویا ہوا۔

"بعض حالات ایسے ہوتے ہیں، جن میں ایک بچے کو یہ پتہ تک ہی نہیں چل سکتا کہ وہ جس عورت کی گود میں پرورش پا رہا ہے، وہ اس کی اپنی ماں نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ اس کو ہی اپنی ماں سمجھتا ہے اور وہ ماں باپ بھی اسے کسی کمی کا شکار نہیں ہونے دیتے تو ایسے بچوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

زیبو یہ سُن کر تھوڑی دیر تک چپ رہی پھر وہ بولی۔

"ایسے حالات میں وہ عورت جس کی گود میں پرایا بچہ پل رہا

ہے، اس احساس کا شکار ہوتی ہے کہ وہ جس بچے کی پرورش کر رہی ہے وہ اس کا اپنا بچہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس سے پرورش کے دوران ایسی حرکات سرزد ہوتی رہتی ہیں، جن کا اثر بچے کی پرورش پر پڑتا رہتا ہے اور بات پھر وہیں کی وہیں رہ گئی کہ ایسے بچے کی شخصیت کسی حال میں بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

زیبو نے اپنی باتوں سے اس چھڑی ہوئی بحث کو اور وزنی بنا دیا۔

"بس چھوڑو بھی اب اس فضول بحث کو، دفعان ہوں مُرغیاں اور ناس ہو ان کی پرورش اور تربیت کا۔ بچے مشینی ہوں یا کہ مرغیوں نے پرائے انڈے ہَسہ کر نکالے ہوں، مرغی کے چوزے ہی کہلائیں گے۔"

ہُما نے اس بحث سے گھبرا کر بات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن ہما بہن! یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ فارم کے چوزے اپنی حفاظت اتنی اچھی طرح نہیں کر سکتے جتنی ایک مرغی کے پروں تلے چوزے پَل کر کرتے ہیں۔"

مہرو نے جو بڑی دیر سے خاموشی سے بیٹی کی باتیں سُن رہی تھی، ہما کی بات کا جواب دیا۔

"اور یہ اس واسطے کہ انھوں نے اپنی ماں کے سینے سے گرمی لے کر بڑے اطمینان سے خطرات کا مقابلہ کرنے کی تربیت لی ہوتی ہے۔"

زیبو نے پھر دلیل پیش کی۔ ڈاکٹر نے عنایت کی طرف دیکھے بغیر، خلاؤں میں گھورتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"عنایت بھائی! اس بارے میں تمہاری اپنی کیا رائے ہے؟"

" ارے وہ تو سو رہے ہیں! زیبو کے ابا ڈاکٹر بھائی کچھ پوچھ رہے ہیں، جواب دو نا!"

مہرو سوتے ہوئے عنایت کو جگانے لگی۔

" نہیں سو تو نہیں رہا تھا۔ ہاں۔ ہاں کیا کہا ڈاکٹر بھائی تم نے؟"

عنایت نے نیند سے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا

" تو تم نے جب کچھ سُنا ہی نہیں ہے تو کیا جواب دو گے!" پھر اس نے زیبو کو مخاطب کیا۔

" زیبو! تم نے مجھے آج لاجواب کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمہارا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ تم جیسی ذہین اولاد کو تعلیم سے محروم رکھنا قوم کی کتنی بڑی بد قسمتی ہے۔"

اور جاوید نے زیبو کو بالکل اپنے دل کے قریب محسوس کیا۔

زیبو نے شرماتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

" چچا جی! آپ کی ذرہ نوازی ہے جو میرے بارے میں اتنے اُونچے خیالات رکھتے ہیں ورنہ میں جانتی ہوں کہ میں کیا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

عنایت اللہ خاں اب تک پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے بڑے فخر سے کہا۔

" زیبو میری بیٹی ہے، عمل پر زیادہ تکیہ کرتی ہے، مطالعے سے زیادہ اپنے تجربات اور مشاہدات سے سیکھتی ہے۔"

" اب کے جب آؤں گا نا! تو تمہارا فارم دوبارہ دیکھوں گا اور تمہاری ان کہی ہوئی باتوں کی روشنی میں دیکھوں گا۔"

" اور اب میرا خیال ہے کہ دھوپ کو ذرا میری نظر سے دیکھو،

اس کی وہ زردی بھی ختم ہونے والی ہے ۔ اب مجھے اجازت دیں ، انشأ اللہ کل جاوید بیٹے کی سالگرہ پر حاضر ہوں گا "

عنایت اللہ خان نے اٹھتے ہوئے سب سے اجازت طلب کی۔

" ذرا جلدی آجانا! بہتر ہوگا، صبح صبح آجاؤ "

ڈاکٹر نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

" ذرا مشکل ہے ، فارم کے کام کے علاوہ کل پانی کی باری ہے۔ فصلوں کو پانی بھی دینا ہے ، مشکل سے شام تک فارغ ہو سکوں گا "

" چلو خیر ہے تم مت آؤ ، ہم ماں بیٹی ہیں نا ! "

مہرو بھی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

" کیوں ! کیوں نہ آؤں ! ہر ایک کی اپنی اپنی جگہ ہے۔ میں چچا ہونے کے ناطے سے شریک ہوں گا۔ اچھا ۔ خدا حافظ "

جاوید کو کمیشن لئے کافی دن ہو گئے تھے ۔ وہ ٹریننگ پر گیا ہوا تھا ۔ زیبو نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا ۔ وہ اب بھی ڈاکٹر کے ہاں رہ رہی تھی ۔ اس خاندان کے معمول میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا ۔ جاوید گھر سے باہر تھا اور زیبو نے اس گھرانے کے ایک فرد کے طور پر جگہ بنالی تھی اور اب ان دونوں خاندانوں میں اجنبیت کی وہ رہی سہی ٹوٹی پھوٹی دیوار بھی عرصہ ہوا منہدم ہو چکی تھی اس کے آثار تک مٹ چکے تھے۔

زیبو جب کالج چلی جاتی تھی تو ہما وقت گزارنے کے لئے رضیہ کے سنٹر کبھی خود جاتی اور اگر اسے فرصت نہ ہوتی اور دو چار دن تک چکر نہ لگا پاتی تو رضیہ ٹیلی فون کر دیتی یا خود ہی آ کر لے جاتی تھی۔

زیبو نہ صرف پڑھائی میں آگے تھی بلکہ اب تو وہ گاؤں کی لڑکی ہوتے ہوئے بھی کالجوں کے مباحثوں میں حصہ لینے لگی تھی۔ شروع شروع میں وہ مباحثوں کے موضوعات پر کسی کی لکھی ہوئی رٹ رٹا کر ڈیبیٹس میں شرکت کرتی رہی، پھر خود ہی لکھنے لگی اور وہ وقت بھی آیا کہ کسی بھی موضوع پر فی البدیہہ بولنے لگی تھی اور اس طرح کئی چھوٹے موٹے انعامات حاصل کرتی رہی۔ اس کا حوصلہ بڑھتا رہا، عنایت کا سر فخر سے بلند ہوتا رہا —— اور جاوید اس کی طرف کھنچتا رہا۔

ایک روز صبح ہی سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مارچ کے مہینے کے شروع کے دن تھے۔ پشاور میں موسم بہار اپنے پورے عروج پر تھا۔ فضا میں ہر طرف رنگارنگ پھولوں کی خوشبو مہک رہی تھی۔ آڑو، ناشپاتی، خوبانی اور آلو بخارے کی شاخیں سفید اور پیازی پھولوں سے لدی پھندی جھک جھک جاتی تھیں —— "جاوید ولا" پر بھی بہار اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ بڑے لان میں اِرد گرد خوشنما پھولوں کے تختے سجے ہوئے تھے۔ ہری ہری گھاس خوب اُگی ہوئی تھی۔ ہما کی خوش ذوقی کے سبب "جاوید ولا" میں گھاس کا ایک تنکا بھی ترتیب سے باہر نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس لئے پورا لان ہر امخملیں فرش نظر آیا کرتا تھا اور جو بھی ایک بار نرم نرم گھاس کے اس خوبصورت لان میں کرسی رکھ کر بیٹھ جاتا اس کا اُٹھنے کو دِل ہی نہ کرتا۔ لیکن آج بوندا باندی کے سبب ہما، زیبو، ڈاکٹر اور جاوید اندر اپنے اپنے کاموں میں

مگن اِدھر اُدھر پھرتے رہے ہے۔ جاوید کافی دنوں بعد چھٹی پر گھر آیا تھا اور آنے کے ساتھ ہی ماں نے بتا دیا تھا کہ زیبو نے انٹر کالج ڈیبیٹ میں انفرادی طور پر فرسٹ پرائز اور کالج کی ٹیم میں ٹرافی جیت لی ہے۔ سرسری مبارک سلامت تو ہو چکی تھی لیکن اس سے جاوید کی تسلی نہ ہو سکی تھی۔ چنانچہ وہ موقع کی تاک میں رہا اور جب زیبو کو اپنے کمرے میں اکیلا دیکھا تو اجازت لے کر اندر آگیا۔

"دیکھونا! کیسے مبارک موقعہ پر آیا ہوں! مانتی ہو کہ نہیں؟"

جاوید نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

"مانتی ہوں یہ سب تمہاری محنتوں کا ثمرہ ہے"

"تب ہی تو اصرار کر رہا تھا کہ کالج میں باقاعدہ داخلہ لے لو اس طرح مختلف خاندانوں کے بالکل مختلف مضامین کے الگ الگ لیکچررز سے بحث مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کچھ سُن لیتا ہے، کچھ کہہ دیتا ہے اور معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اسکول میں اتنا کچھ نہیں سیکھا جا سکتا۔ کالج میں انسانی ذہن بلوغت کی حدود میں ہوتا ہے۔ یونیورسٹی میں پہنچتے پہنچتے شعور بھی پختہ ہو چکا ہوتا ہے اور پختہ شعور بالغ ذہن کی معیت میں انسان کو انسانیت کی خدمت کے لئے صحیح خطوط پر کام کرنے کے قابل بناتا ہے"

جاوید کا لیکچر زیبو بڑے غور سے سنتی رہی۔ جب وہ خاموش ہوا تو دیکھا کہ زیبو دانتوں سے ناخن کاٹ رہی ہے اور لگتا تھا جیسے کچھ کہنے کو بے تاب ہو۔

"اس بارے میں مجھ سے اختلاف رکھتی ہو کیا؟"

"نہیں تو، ویسے سوچ رہی ہوں یونیورسٹی تک پہنچ بھی سکوں گی یا۔۔۔۔"

زیبو نے جان بوجھ کر ادھورا چھوڑا۔

"واہ! میری شاگرد ہو کر یونیورسٹی کیسے نہیں پہنچو گی، اب تمہارا بی اے فائنل ہے، تمہارے امتحانات دینے تک میری پوسٹنگ شاید یہیں کہیں اپنے صوبے کے کسی ہاسٹل میں ہو چکی ہو۔"

جاوید بڑے پُر اُمید لہجے میں بول رہا تھا۔

"جب تم فوجی وردی پہنے گھر آئے تھے تو اتنے خوبصورت لگ رہے تھے۔"

زیبو نے موضوع کا رُخ موڑتے ہوئے کہا۔

"اور اب جب کہ فوجی وردی میں نہیں ہوں تو خوبصورت نہیں لگ رہا ہوں؟"

جاوید کی آنکھوں میں دنیا جہان کی شرارت بھر آئی تھی۔

"کیوں نہیں، تم کب خوبصورت نہیں لگے۔ لیکن اس طرح جوان لوگ بڑے اسمارٹ نظر آیا کرتے ہیں۔"

"میں تو ویسے بھی بڑا اسمارٹ ہوں، ماروں ایک سیلیوٹ!"

اور جاوید آنکھ جھپکتے میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر سیلیوٹ کر چکا تھا۔

"یہ سیلیوٹ اپنے افسروں کو کیا کرو تو اچھے لگو گے۔"

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے۔ جیسے ان کے پاس باتوں کے لئے موضوع ختم ہو گئے ہوں۔ زیبو کو یہ خاموشی شاق گزر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے موضوع تلاش کر ہی لیا اور پوچھا۔

"وہاں تو بہت خوش ہو گے نا!"

"تو یہاں پر میں خفا تھا کیا؟"

"میری باتوں سے تنگ آجایا کرتے تھے۔"

"میں تو کبھی بھی تمہاری باتوں سے تنگ نہیں ہوا تھا۔ یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟"

جاوید کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔

"وہ اس طرح نا کہ میں اپنے طور پر سیدھی بات بھی کرتی تھی تو تم اس کا الٹ مطلب لے لیتے تھے اور پھر گھنٹوں بحث میں اُلجھ کر اس طرح میرے پیچھے پڑے رہتے تھے کہ جب تک میں رو نہ پڑتی تم جان نہیں چھوڑتے تھے۔"

"تو اس طرح تم تنگ ہوتی تھیں یا میں؟"

"تم طیش میں بڑی جلد آجاتے تھے۔"

"نہیں یہ بھی غلط الزام لگا رہی ہو؟ میں تم پر غصے کیوں ہوتا بھلا! دراصل زیبو بی بی وہ میں تم کو انجانے میں بحث مباحثے کے لئے تیار کر رہا ہوتا تھا۔ اب دیکھو اس کا انجام۔ اب اوّل انعام لے اُڑیں۔"

جاوید نے یہ کہتے ہوئے دائیں ہاتھ سے ایک چٹکی بجائی۔

"اچھا تو وہ میری ٹریننگ ہو رہی ہوتی تھی؟"

زیبو نے مصنوعی حیرانگی سے پوچھا۔ "تو اور کیا؟"

تھوڑی دیر خاموشی رہی، جاوید پر اب بالکل سنجیدگی طاری ہو چکی تھی۔

"میں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں کہ تم ہر لحاظ سے اتنی اُونچی ہو جاؤ اتنی اونچی کہ تمام لوگ تم پر فخر کرنے لگیں اور میری گردن بھی فخر سے تنی رہے۔"

"کہ میری شاگرد اتنی لائق نکلی۔ ہے نا!"

زیبو نے ہنس کر کہا۔

"لائق تو تم خود ہی ہو، بس — ویسے میرا دل یہی چاہتا ہے"
جاوید نے زندگی میں پہلی بار زیبو کے سامنے دل پہ ہاتھ رکھا۔ زیبو کو بڑا اچنبا ہوا اور جاوید بھی اپنی اس حرکت پر شرمندگی سی محسوس کرنے لگا۔

"دل کی ہر خواہش پوری نہیں ہوا کرتی۔"
زیبو نے بڑی دیر بعد آہستہ سے کہا۔

"جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو میرا دل جو کچھ کہتا ہے، وہ پورا ہو کر رہے گا اور یہ مت بھولو، کہ صادق دل کبھی بھی جھوٹی گواہی نہیں دیا کرتا۔"

دونوں کی باتیں کافی سنجیدگی اختیار کر چکی تھیں۔ جاوید کے آخری جملوں پر زیبو کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اس کی نظریں زمین میں گڑ چکی تھیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے یا تو وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی یا شاید رونے کے قریب تھی کہ اتنے میں ہما کی آواز آئی۔

"زیبو — جاوید — آؤ نا چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے — کتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں"

"جی اچھا آپی بس آ رہے ہیں"
جاوید نے اونچی آواز سے جواب دیا۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ زیبو اس حالت میں چائے پینے نہ جا سکے گی۔ پہلے تو اس نے اسے بہت کہا کہ وہ اپنی حالت پر قابو پالے لیکن جب اس کی حالت اور خراب ہونے لگی تو جاوید کو عافیت اسی میں نظر آئی کہ وہ خود تو جا کر ماں کے ساتھ چائے پی لے اور معقول سا بہانہ بنا کر زیبو کے لئے چائے اس کے کمرے ہی میں بھجوا دے، چنانچہ وہ زیبو کے قریب آیا اور اس نے اس کے

چہرے پر بچوں کی سی معصومیت سے دو تین تھپکیاں دیں۔
اس وقت اس سے یہی ہو سکتا تھا۔

"تمہاری چائے یہیں پر نوکر کے ہاتھ بھجواتا ہوں"
اس نے زیبو سے سرگوشی کے سے انداز میں کہا اور خود
لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور زیبو کو یوں لگا
جیسے وہ کسی اُونچے درخت کی اُونچی ہری شاخ پر لٹکی ہوئی
ہوا میں ہچکولے کھا رہی ہو اور اُتر بھی نہ سکتی ہو کہ زمین دُور تھی
اور اوپر چڑھ بھی نہ سکتی ہو، کہ ہوا میں لٹک رہی تھی۔

ابھی ابھی عنایت اللہ خان اپنے حجرے سے ہو کر آیا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کی تھکاوٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

اس کا حجرہ گھر سے ذرا سے فاصلے پر ایک ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ یہ ٹیلہ اتنا اونچا تو نہ تھا لیکن زمین سے کافی بلندی پر تھا۔ اس پر چڑھنے کے لئے ٹیلے کے ڈھلوان پر فاصلے فاصلے سے سیڑھیاں سی بنا کر ان سے زینے کا کام لیا گیا تھا۔ اس قسم کی مٹی کی سیڑھیاں دیہات کے اکثر کچے مکانوں اور تہ خانوں میں بنی ہوتی ہیں۔

کچے مکانوں کے کوٹھوں پر چڑھنے کے لئے نیچے سے اوپر کی طرف تہہ در تہہ مٹی کے پائیدان سے بنا دیئے جاتے ہیں جو سیڑھی کا کام دیتے ہیں۔ اسی طرح کی سیڑھیاں گرمی سے بچنے کے لئے ہاتھ سے کھودے گئے تہ خانوں میں بھی اوپر صحن سے نیچے کی طرف بھی بنی ہوتی ہیں۔ چنانچہ جس سال بارشیں بہت ہوتی ہیں اس سال کئی تہ خانوں کی سیڑھیاں بارش کی تیز دھار کے ساتھ بہہ جاتی ہیں۔ اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے کئی تدابیر کی جاتی ہیں۔ تہہ خانے پر لکڑی کا ڈھکن بنوایا جاتا ہے۔ جب بارش ہو تو اسے ڈھک دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بارش کے پانی کو اندر جانے سے روکنے کے لئے تہہ خانوں کے ارد گرد مٹی کی منڈیریں

بھی بنائی جاتی ہیں۔ لیکن جب جھڑی چند روزہ لگی ہو تو اس قسم کی پیش بندیاں بھی ناکام ثابت ہوتی ہیں اور پانی تہہ خانوں میں بھر جاتا ہے۔

عنایت اللہ خان کا حجرہ چونکہ ٹیکہ نما اونچائی پر بنا ہوا تھا اس لئے اونچا حجرہ کہلاتا تھا۔ عنایت نے اپنے حجرے میں ایک اور سہولت بھی رکھی تھی، اس نے گہرا چھ طاقچہ تہہ خانہ کھدوایا تھا۔ جس میں گاؤں کے بچے اور بوڑھے گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے دوپہر گزارتے تھے اور جب جیٹھ ہاڑ کی جھلسا دینے والی لُو چلا کرتی تو یہ تہہ خانہ گوشۂ عافیت سمجھا جاتا تھا۔ اکثر مائیں اپنے شیر خوار بچے اپنے شوہروں یا گھر کے کسی اور فرد کے حوالے کر کے تہہ خانے میں بھجوا دیا کرتی تھیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو ہمسایہ یا فقیر کے نام سے پکارے جاتے تھے اور گاؤں کے متمول خاندان کے معمولی معمولی ایک یا دو کمروں کے گھروں میں مفت رہتے تھے، یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو تہہ خانہ کھدوانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔

جب عنایت گھر پہنچا تو مہرو خادماؤں کی مدد سے چائے کے برتن سمیٹ رہی تھی۔ یہ چائے عنایت کے پاس، کریم خان کی طرف سے آئے ہوئے جرگے کے نمائندوں کو پلائی گئی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ کچھ عرصے سے کریم خان کے ہاں سے دوسرے تیسرے روز چند عورتیں آجاتی تھیں، جو عنایت اور مہرو کو زیبو کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے پر مجبور کرتی تھیں۔ لیکن عنایت بھی اپنی بات پر اڑا رہا کہ جب تک شفیق بی اے پاس نہیں کر لیتا زیبو کی شادی اس سے نہیں ہو سکتی۔ ادھر شفیق ابھی ایف اے ہی میں پھنسا ہوا تھا۔ بی اے کرنا تو دور کی بات تھی۔ دراصل عنایت اس رشتے پر راضی تھا ہی نہیں۔

لیکن کیا کرتا بڑوں کے منہ کی بات تھی، بڑا بھی ان کا اپنا تایا تھا۔ پختونوں کے قانون کے تحت منگنی تڑوانا بھی جوئے شیر لانا تھا۔ اس لئے یہ اڑی صرف ایک بہانہ تھی، ورنہ وہ سرے سے راضی ہی نہ تھا۔

جب بات حد سے بڑھنے لگی تو کریم خان گاؤں کے چند سفید پوش باریش اور اثر ورسوخ والے لوگوں کو اکٹھا کر کے جرگہ کے طور پر عنایت کے پاس لے آیا۔ اس قسم کے جرگے میں عموماً امام مسجد، گاؤں کے سید، میاں اور اس طرح کے دوسرے معززین شریک ہوتے ہیں۔

کسی پشتون کے پاس جب اس قسم کا جرگہ آتا ہے تو ایک طرف اس کی عزت افزائی ہوتی تو دوسری طرف جرگہ فریقِ اوّل کی بات فریقِ ثانی سے منوا کر ہی دعائے خیر مانگتا ہوا اٹھتا ہے۔ ایسے جرگے کسی مسجد یا حجرے میں ہوا کرتے ہیں اور گاؤں کے باقی تمام لوگ بھی اس میں شرکت کر سکتے ہیں اور اگر فریقِ ثانی نے جرگہ نہ مانا تو تمام گاؤں والے یہ اپنی سبکی سمجھ کر ناراض ہو جاتے ہیں اور اکثر حالتوں میں فریقِ ثانی کا حُقّہ پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ عام طور پہ جرگہ عشاء کی نماز کے بعد آتا ہے۔

•

عنایت جب حجرے سے تھکا ہارا گھر آیا، تو اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے سوچنے سمجھنے کی سب طاقتیں سلب ہو گئی ہوں۔ وہ آتے ہی صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پہ دراز ہو گیا۔

مہرو دوڑتی ہوئی آئی اور شوہر کے سر تلے تکیہ رکھ دیا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش کھڑی رہی، اس کو جرگے کے پل پل کی خبر پہنچ چکی تھی۔ وہ ساتھ والی چارپائی پہ بیٹھ کر آہستہ سے بولی۔

"زیبو کے ابا اب تو وہ لوگ جرگہ لے آئے، انکار مت کرنا۔ ایک ہی بیٹی ہے۔ کہیں اُسے کچھ ہو نہ جائے"

"تو میری بات وہیں کی وہیں ہی رہ گئی۔ جہاں تمہاری بھاوج صاحبہ نے اٹکائی تھی؟"

"بی اے نہ کر سکا تو کیا ہوا! خیر سے حجرے میں دو موٹریں اور ایک نیا ٹرک کھڑا ہے۔ گھر بھی اتنا خوبصورت بنوایا ہے جیسے محل۔ ہماری زیبو شہزادی بن کر راج کرے گی"

"لیکن وہ شہزادہ جو نالائق ہے!"

"کوئی بات نہیں ہے، دیکھو نا! جرگے کے سامنے قسم بھی کھالی کہ اگر سیر سونا بھی مانگو تو وہ دینے کو تیار ہیں۔ باقی کچھ لکھنا لکھانا چاہو، اس سے بھی انکار نہیں کریں گے پھر کیوں ناحق تنگ کرتے ہو؟"

مہرو کے لہجے میں منت سماجت کی چاشنی رچی ہوئی تھی۔ جسے عنایت بھی محسوس کر رہا تھا۔

"میں حق پہ ہوں، لیکن تیرے بھائی کی یہ دولت! مجھے ناحق کی چھینی ہوئی لگتی ہے"

"کیوں؟ کس سے چھینی ہے دولت؟ اگر میرولی کی زمین میرا بھائی نہ خریدتا تو کوئی اور خرید لیتا۔ وہ تو مقدمے کے لئے زمین ہر حال میں بیچ رہا تھا اور گل شیدے کی بن چکی تو اس کے ورثا اس سے زبردستی قبضنا ... رہے تھے۔ اس کا سودا تو گل شیدہ نے پہلے ہی فضل حق کے ساتھ کر دیا تھا۔ کونسا کفر ٹوٹا جو میرے بھائی نے ڈیڑھ دو سو روپیہ اس بیوہ کو زیادہ دے کر پن چکی اپنے نام لکھوالی۔ وہ بڑے کیا کہہ گئے ہیں کہ "دوستی بہ خوشی، سودا بہ رضا"

"لیکن اس دوستی سے نہ میں خوش ہوں نہ راضی ہوں اور نہ ہی زیبو کے ساتھ تیرے بھتیجے کا یہ جوڑ مناسب سمجھتا ہوں۔"

"آخر وہ بیچارہ تم کو اتنا بُرا کیوں لگتا ہے؟"

"اس میں اچھی لگنے والی بات ہی کونسی ہے اور دوسرے اُن کی یہ دولت مجھے کالا دھن لگتا ہے۔"

" تو کیا کرتے ہیں ڈاکے ڈالتے ہیں؟"

مہرو غصے میں بولی۔

" مجھے نہیں معلوم! کہ کیا کرتے ہیں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ حلال کی کمائی میں اتنا کرّ و فر نہیں چل سکتا۔ مجھ سے لکھوا لو۔ یہ پیسہ ان کے پاس غلط راستوں سے چلا آرہا ہے۔"

" جن راستوں سے بھی آرہا ہے۔ تمہارا گھر بھرنا چاہتے ہیں! تم کو سیروں سونا دینا چاہتے ہیں، شکر نہیں کرتے!"

" یہ سیروں سونا میرے گھر آئے گا کہ ان کے گھر زیور کی صورت میں واپس جائے گا اور کیا میں بیٹی کو یونہی رخصت کروں گا کچھ دیئے بغیر! بلکہ وہ لوگ تو تمہاری تمام جائداد پر نظر رکھے بیٹھے ہیں۔ میں اتنا بھی نہیں جانتا اور یہ منگنی کا دانہ انہوں نے حرص کے دام میں اس لئے پھنسائے رکھا تھا کہ وہ زیبو کے ساتھ ساتھ تمام جائداد کے مالک بھی بن بیٹھیں گے۔ وہ لوگ ان باتوں سے خوش ہوتے ہیں میں نے کبھی بھی پرائی دولت پر نظر نہیں رکھی۔"

" تمہارے لئے پرائی ہوگی، میرے تو اپنے بھائی کی ہے اور تمہارا بھی تو ایک طرح سے بھائی لگتا ہے۔ لیکن تم نے تمام عمر کریم خان کو تربور ہی کی نظر سے دیکھا۔ ہماری اپنی نرینہ اولاد نہیں ہے، شکر کرو بیٹی دیدیں گے، بیٹا مل جائے گا۔"

"اور بیٹا بھی ماشاءاللہ ہے۔!"

عنایت نے نہایت طنز سے کہا اور چارپائی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہر حال کہلاتا تو ہمارا ہی داماد ہے۔"

اس پر عنایت خاموش ہوگیا اور مہرو نے الخاموشی نیم رضا کے مصداق شوہر سے مطالبہ کیا کہ وہ اسے جہیز بنانے کے لئے کچھ رقم مہیا کرے۔ عنایت نے بینک چیک لکھ کر دے دیا۔ رقم کی مالیت بیوی کے صوابدید پر چھوڑ دی اور مہرو بھی خرچے کا اندازہ نہ لگا سکی، کیونکہ وہ جہیز کے لئے خریدی جانے والی کسی چیز کی قیمت سے بھی واقف نہیں تھی۔ عنایت کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ سب کچھ تازہ اور نیا خریدا جائے گا۔ کیونکہ زیبو کے جہیز کے لئے زیورات میں سے ایک چھلا تک پہلے سے خرید کر نہیں رکھا گیا تھا اور یہی حال کپڑے لتے کا تھا اور فرنیچر تو بہر حال خریدنا ہی تھا۔ مہرو نے اس پر شوہر سے کہا۔

"ہما بہن کو ساتھ لے چلوں گی، چیزیں خریدنے کو اور ساتھ ہی زیبو کی شادی کا بھی بتا دوں گی۔ پہلے تو تم نے پتہ نہیں کس مصلحت کی بنا پر مجھے بھی منع کیا تھا کہ زیبو کی شفیق کے ساتھ منگنی کی بات کبھی بھولے سے بھی ان کے سامنے منہ سے نہ نکالنا۔ اب تو معلوم ہو جانا چاہیئے اُن کو بھی —— اگر کچھ وہ تیاری وغیرہ کرنا چاہیں —— اور دیکھو زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کی مہلت رکھنا شادی میں، اب برسوں پر مت ٹال دینا۔ بس بہت ہو چکا۔ آخر اور کتنا صبر کریں گے بیچارے!!"

مہرو نے ایک ہی سانس میں ڈھیر ساری باتیں کہہ ڈالیں

اور بھائی بھاوج کی ایک طرح وکالت بھی کی۔

"بی اے تو کر لینے دو زیبو کو۔ دو چار مہینے ہی رہ گئے ہیں امتحان میں۔" عنایت نے زچ ہو کر بڑی بیچارگی سے زیبو کے حق میں یہ کلمات منہ سے نکالے۔

"نا بس!! ہو چکی بہت، انہیں کونسی اس سے نوکری کروانی ہے۔ اتنا بھی بہت ہے۔ بس پڑھ چکی جتنا پڑھ سکتی تھی۔ شفیق ویسے بھی پہلے ہی سے اس کی پڑھائی کا مخالف تھا اور ہاں زیبو کو بھی ساتھ ہی لے آؤں گی۔"

عنایت کو یوں لگا، جیسے وہ ایک بہت بڑی بازی ہار چکا ہو۔ وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح لڑکھڑاتے قدموں سے باہر کو یونہی بے مقصد چلا گیا۔

"اس معاشرے میں ایک بیٹی کا باپ ہونا کس قدر مشکل اور کٹھن ذمہ داری ہے؟" اس نے خود سے کہا۔

دو تین روز سے زیبو ڈاکٹر کے گھر سے چلے جانے کی تیاریوں کے سلسلے میں روز اپنی ذاتی چیزیں اکٹھی کرتی رہی اور شام ہونے سے پہلے ہی سب چیزیں اپنے لئے مخصوص کئے گئے کمرے میں دوبارہ سجاتی رہی، وہ کچھ مخمصے میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طاقت کے تحت اپنی چیزیں سمیٹ کر گاؤں جانے کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور کونسی وہ مرئی کشش ہے جو شام ہوتے ہوتے اس سے ہر چیز پھر اپنی اپنی جگہ جوں کی توں واپس رکھوا دیتی ہے۔

اور جب آج صبح وہ سو کر اٹھی تو اس نے رات کئے ہوئے فیصلے کے تحت کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا اور ہر چیز اپنی جگہ پر یونہی رہنے دی۔ یہ اس کا آخری فیصلہ تھا، وہ ماں باپ کی مرضی کے مطابق یہاں سے گھر چلی جائے گی اور پھر ماں باپ کے گھر سے شفیق کے گھر کی ہو جائے گی اور یہاں اس گھر میں اُس کی ہر چیز یونہی پڑی رہے گی۔ اس نے رات کو یہ بھی سوچا تھا کہ وہ ڈاکٹر چچا اور چچی کو اپنی اس خواہش سے آگاہ کرے گی کہ اس کا کمرہ اسی طرح رہنے دیا جائے لیکن کیونکر؟ آخر کیوں؟ اس "کیوں" کا جواب تو خود اس

کے پاس بھی نہ تھا، ہاں اگر ہما چچی یا ڈاکٹر چچا نے مناسب نہ سمجھا تو پھر اس کا ذاتی سامان اس کے ماں باپ کے گھر بھجوا سکتے ہیں۔ سب کچھ ہو سکتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا!! وہ اسی طرح اپنے کمرے میں بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی ۔ اس کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کل رات گئے جاوید گھر آ گیا تھا اور وہ اس کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔

ماں باپ نے ضرور اُس سے اس کی شادی کی بات کی ہوگی؟ پھر کیا؟ کیا جاوید کے احساسات اس کے ماں باپ سے مخفی ہیں؟۔ جاوید کے احساسات؟ کونسے احساسات، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خود غلط فہمی کی شکار ہو؟ لیکن اس کی وہ اس روز والی باتیں! میں وہ سچ سمجھوں کہ یہ جو کچھ ہونے والا ہے اسے تسلیم کرلوں۔

وہ اسی طرح کی سوچوں میں غرق تھی۔ ناشتے میں ابھی کافی دیر تھی، چھٹی کے روز اس گھر میں ناشتہ بڑی دیر سے کیا جاتا تھا اکثر دن کے دس اور گیارہ بجے جاتے تھے۔ صبح صبح ایک ایک پیالی چائے اور ساتھ بسکٹ بیڈ ٹی کے طور پر ملا کرتے تھے، جو گھر کی ملازمہ یا ملازم ہر ایک کے کمرے میں پہنچا دیتا تھا۔ زیبو چائے پی چکی تھی کہ دروازے پر آہستہ سی دستک ہوئی۔ دستک کے ساتھ ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا اُسے یوں لگا جیسے اس کا ہارٹ فیل ہونے والا ہو۔ وہ سانس روک کر دروازے کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ پہچان گئی تھی کہ یہ جاوید کی دستک تھی۔ جاوید نے اجازت ملنے پر کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا اور زیبو پر نظر پڑتے ہی دونوں پاؤں ملا کر ایک زوردار سیلیوٹ مارا۔

"آپ اتنی جلدی کیسے آ گئے؟ ابھی ابھی تو گئے تھے"

زیبو نے جاوید کو کرسی پیش کرتے ہوئے اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو بُرا ہوا؟"

جاوید نے زیبو کے "آپ" کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

"بُرا ہوا یا اچھا مجھے اس سے کیا؟"

"تو پھر پوچھا کیوں؟"

"یونہی!" زیبو جلدی سے بولی "میرا مطلب ہے۔ کہ ابھی تو آپ کی ٹریننگ میں کچھ وقت باقی تھا"

"تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ ٹریننگ ختم کرکے آرہا ہوں"

جاوید نظروں ہی نظروں میں زیبو کی بات کو تولتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے، آپ کی چھٹی حس نے آپ کو بتا دیا ہوگا — تبھی تو آپ بھاگے بھاگے چلے آئے!"

"تمہارے فائنل کے امتحانات میں چند روز باقی تھے، تمہاری ہیلپ کے لئے آگیا ہوں لیکن بڑے بہانے بنا کر"

جاوید کا موڈ بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور کمرے کی ایک ایک چیز کو ہاتھ میں اُٹھا اُٹھا کر یوں دیکھنے لگا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو؟ حالانکہ وہ عموماً اسی کمرے میں زیبو کو پڑھایا کرتا تھا اور زیبو نے جو پچھلے دو چار روز سے ہر چیز کئی بار اپنی جگہ سے ہٹا کر پھر اسی ترتیب سے رکھ دی تھی اب جاوید ان کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔ زیبو جاوید کی اس حرکت سے لرز سی گئی اور وہ اس غیر مرئی طاقت کی قائل ہوئی جس نے اسے جاوید کے اچانک آنے کی اطلاع پہلے سے دے دی تھی اور جو جاوید مجبور کر رہی تھی کہ زیبو کی آنکھوں کے سامنے ہر چیز کو ہاتھ لگا لگا

کر، چھوئے، دیکھے - زیبو یہ بھی جانتی تھی کہ اس کمرے کی ہر چیز کچھ عرصہ بعد اس کے پاس گاؤں پہنچا دی جائے گی اور پھر تصور کی آنکھ سے دیکھا کرے گی کہ جاوید چیزیں ہاتھوں میں اُٹھا اُٹھا کر دیکھتا جاتا ہے اور اسی طرح پھر واپس اپنی جگہ رکھتا جاتا ہے۔

جب زیبو نے کوئی جواب نہ دیا تو جاوید پھر کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

"کیا تمہیں یہ بُرا لگا، کہ میں صرف ایف، ایس، سی ہوں اور تم بی اے کا امتحان دے رہی ہو؟ اور میں کیسے تمہاری HELP کر سکتا ہوں"

"یہ بات نہیں ہے، مگر مجھے تمہاری مدد کی اب ضرورت نہیں رہی"

"مگر کیوں؟"

جاوید نے بڑی حیرت سے پوچھا!

"میں شاید امتحان نہ دے سکوں"

"کیوں؟ تیاری نہیں کر سکی ہو؟"

"میں تو تیاری کر رہی تھی لیکن داجی اور بے بے نے میری تیاری سے پہلے ہی تیاریاں شروع کر دیں"

"امتحان تم کو دینا ہے اور تیاری دابی اور بے بے کر رہی ہیں؟"

"میں نے بتایا نا کہ امتحان نہیں دے رہی ہوں"

"لیکن تم نے تو کہا کہ شاید امتحان نہ دے سکوں!"

"لیکن ــــ یہ بات حتمی ہے کہ امتحان نہیں دے رہی ہوں"

"لیکن آخر کیوں ــــ ں؟"

جاوید کیوں پر زور دیتے ہوئے اپنی کرسی سے اُٹھا اور اس پلنگ پر آکر بیٹھا، جس پر زیبو بیٹھی ہوئی تھی -

اور پھر زیبو نے بے ربط سے جملوں، ٹوٹے پھوٹے اور ادھورے الفاظ میں جاوید کو شفیق کے ساتھ اپنی بچپن کی نسبت اور پھر شادی

کی بات بتا دی۔ اس تمام عرصہ میں زیبو کی آنکھ سے ایک بُوند بھی نہیں ٹپکی، حالانکہ اس کی آنکھیں بڑی دیر سے ڈبڈبا رہی تھیں۔ اس نے اپنی آواز پر بھی خاصا قابو رکھا تھا لیکن کوشش کے باوجود بھی اس کے لرزتے جسم کے ساتھ اس کی آواز کانپ رہی تھی اور زیبو نے یہ اتنا حوصلہ اسی وقت فیصلہ کر کے دکھایا۔ جب کہ منگنی اور شادی کی بات پر جاوید اس کے پاس سے اُٹھ کر سامنے پڑی ہوئی کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ زیبو نے محسوس کیا تھا کہ جس ڈھارس اور سہارے کی اُسے اس وقت ضرورت تھی جاوید نے جان بوجھ کر اس سے اجتناب کیا تھا یا اس کی فطری کمزوری اس کے آڑے آئی تھی۔

"یہ کام کب ہونے والا ہے؟"

جاوید شادی کا نام زبان پر نہ لا سکا۔

"میرے امتحانات کے فوراً بعد!"

زیبو کا جواب تھا۔

جاوید نے شاید عمر میں پہلی بار ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ہنستے ہوئے بولا۔

"اور تم امتحان اس لئے نہیں دینا چاہتیں کہ تم یہ کام بہت جلد کروانا چاہتی ہو؟"

"جاوید؟"

زیبو بھی عمر میں پہلی بار جاوید پر دبی آواز میں چیخی۔

"یہ تم کہہ رہے ہو؟ تم!"

اور اس نے آنسوؤں کے آگے ضبط کا جو بند باندھ رکھا تھا، وہ ٹوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جاوید ذرا سا گھبرایا، لیکن وہ پھر بھی اس کے قریب نہ آیا۔ ذرا دیر چپ رہنے کے بعد،

وہ ہنسا اور ہنستے ہوئے کہا۔

"اس میں رونے دھونے کا کیا ہے؟ جانے بھی دو، اچھا ہے۔ تمہارے سو قسم کے دِلّدر دور ہو جائیں گے۔ یہ لڑکی ذات ہے اور سبق نہ پڑھے! یہ یہاں نہ جائے، یہ وہاں نہ جائے! ان باتوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ خود مختار ہو جاؤ گی۔ جہاں جی چاہا جانے کو جایا کرو گی۔"

جاوید کے لہجے میں بڑا ٹھہراؤ تھا اور زیبو نے محسوس کیا کہ اس کا ایک اور سہارا بھی دھڑام سے زمین آ رہا۔ اس نے آنکھیں خشک کر کے آہستہ سے کہا۔

"وہ ایسے لوگ نہیں ہیں، بلکہ اب میں باقی عمر ایک قیدی کی حیثیت سے گزاروں گی۔ میری پڑھائی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی لوگ تھے۔"

"تو اب تو تمہاری پڑھائی ایک طرح سے مکمل ہی سمجھو، وہ ارمان بھی پورا ہو چکا تمہارا۔"

"جاوید، تم یہ سب کچھ مذاق میں کہہ رہے ہو کہ ..... واقعی تم ..... تم ....."

"ہاں میں پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اس میں مذاق کیسے نظر آیا تمہیں۔"

زیبو یہ سن کر بالکل سنجیدہ ہو گئی، وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر خاموش رہی اور پھر بڑے ہی پُر اعتماد لہجے میں بولی۔

"جاوید، میں تو کچھ اور سمجھی تھی، لیکن افروزنہ نے سچ ہی کہا تھا کہ جاوید ..... جاوید ....." وہ آگے نہ بول سکی۔

"کہ جاوید کیا؟"

جاوید نے دھیرے سے پوچھا۔

"یہ کہ — کہ — کہ ....."

زیبو پھر خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں زور سے دبایا اور اس کی آواز بھرا گئی۔

جاوید زیبو کے پلنگ سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ پیچھے کو باندھ رکھے تھے اور زیبو کے ادھورے چھوڑے ہوئے الفاظ کو جوڑ جوڑ کر بولنے لگا۔ وہ بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

" کہ یہ کہ جاوید کے دیکھے ہوئے تمام خوابوں کی تعبیر الٹی نکلتی ہے۔ کہ جاوید کی زندگی کی بنیاد ہی الٹی پڑی ہے۔ اکہ جاوید کی وہ اپنی سمجھی ہوئی پونجی دوسرے کی ہے، جس پر اس نے اپنے مستقبل کی بنیاد رکھی تھی کہ جاوید کی ہر وہ چیز پرائی ہے، جس کو وہ اپنی سمجھتا تھا"

زیبو کا اوپر کا سانس اوپر تھا اور نیچے کا نیچے!

"جاوید یہ تم نے کیا کہہ دیا"

"یہ جو کچھ تم نے ابھی ابھی سُنا، یہ میری زندگی کا سب سے بڑا سچ تھا۔ یہ میرے دل کی آواز تھی۔ آج کے بعد میں تمہارے لئے مر چکا ہوں۔ میں نے اپنی بہت سی خواہشات کے تابوت پر صبر کی میخیں ٹھونکی ہوئی ہیں اور تمہاری آئندہ زندگی کے بارے میں تمہارے ماں باپ کا یہ فیصلہ ایک آخری کیل تھی، جو میں نے ٹھونک دی۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ کاش میں فوج میں کمیشنڈ آفیسر نہ ہوتا۔ ایک معمولی سپاہی ہوتا، لیکن سینے میں اتنی آرزوؤں کے تابوت دفن نہ ہوتے!"

جاوید نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔ اس نے بڑی بے بسی سے زیبو کو دیکھا، جو آنکھیں پھاڑے، سانس روکے، جاوید کے مُنہ کو تک رہی تھی۔ دونوں دیر تک خاموش رہے، جاوید نے بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو کرسی تک پہنچایا اور اپنا تھکا ہُوا جسم کرسی کے حوالے کر دیا۔

"میں تو سمجھی تھی تم مجھ سے کوئی بات بھی نہیں چھپاتے، پھر اتنا بڑا راز تم نے کیوں چھپایا؟"

"یہ تو میرے دل کی بات تھی، بتا دی، میں نے تم کو اپنی زندگی کا ایک اور راز بھی تو نہیں بتایا ہے"

"وہ کون سا راز ہے؟"

"اگر معلوم کر بھی لوگی تو کیا پا لوگی!"

"تمہیں میرے سر کی قسم! آج کچھ بھی مت چھپاؤ، سب کچھ کہہ دو؟"

"کسی کو بتاؤ گی تو نہیں!!"

"میرا اعتبار نہیں کرتے؟"

"شفیق کو بھی نہیں بتاؤ گی۔"

جاوید کے مُنہ سے شفیق کا نام اچانک نکل گیا تھا، زیبو اس پر چونکی اور اپنے اور جاوید کے درمیان ایک دھند سی چھائی ہوئی محسوس کی۔ اس کا سارا جسم کانپ گیا، لیکن اس نے اپنے آپ کو جلد سنبھالا۔

"شفیق؟ شفیق کو؟ نہیں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی"

"تمہیں یاد ہے وہ دن جب ہم تمہارے گاؤں پہلی بار آئے تھے؟"

"ہاں۔ مجھے ایک ایک لمحہ یاد ہے۔"

زیبو خلاؤں میں کھو سی گئی۔

"اور پھر ہم سب نے تمہارا فارم دیکھا تھا۔"

"ہاں یاد ہے۔"

"اور پھر ایک دن لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، تمہاری امّی ابّو بھی بیٹھے تھے۔"

"سب کچھ یاد ہے۔"

"اور پھر تمہاری امّی نے تم سے ایک بات پوچھی تھی؟"

"بہت سی باتیں پوچھی تھیں۔ کون سی بات کو یاد کر رہے ہو؟"

"یہ کہ تم اپنے مرغی خانے میں انکیوبیٹر لگاؤ، اور تم نے بن ماں کے بچوں کی بات کی تھی کہ ان کی پرورش تو ہو سکتی ہے لیکن تربیت پوری نہیں ہو پاتی اور شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے؟"

"ہاں کہا تھا۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے!"

زیبو نے پورے یقین سے جواب دیا۔

"تو پھر میری شخصیت بھی اس لحاظ سے ادھوری ہی سمجھو!"

جاوید نے یہ الفاظ بڑے دکھ سے اور بڑی مشکل سے منہ سے نکالے۔

"تو تم چچی کے اپنے بیٹے نہیں ہو؟"

زیبو یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اچھلی۔

"اور ڈاکٹر کا بھی اپنا بیٹا نہیں ہوں۔"

"تم کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟"

"میں نے جھوٹ کبھی نہیں بولا، بلکہ دوسروں کے جھوٹ پر پردہ

ڈال کر ساری عمر خود دکھ اٹھاتا رہا ہوں"

جاوید کا لہجہ زخمی تھا اور اس کے ایک ایک لفظ سے خون ٹپکتا ہوا لگ رہا تھا۔

"تم یہ کیسے کہتے ہو کہ تم ان کے بیٹے نہیں ہو؟ ان لوگوں نے تو کبھی بھی اس طرف اشارہ تک نہیں کیا ہے کہ تم ان کی اپنی اولاد نہیں ہو؟"

زیبو کو حیرت کے ساتھ ساتھ یہ شک بھی گزر رہا تھا کہ شاید جاوید کو کسی نے بہکایا ہوگا۔

"ان میاں بیوی کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ میں اب بھی ان کو ماں باپ سمجھتا ہوں لیکن حقیقی نہیں مان سکتا۔ میری ماں میری پیدائش کے ساتھ ہی مر چکی تھی اور اس لئے میں ہر عورت میں اپنی ماں اور ہر لڑکی میں اپنی بہن ڈھونڈتا پھرتا ہوں"

یہ سن کر زیبو کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"تمہارے اپنے والد کہاں گئے؟ تم ان لوگوں کے پاس کیسے آئے؟"

"میرا والد بڑا ظالم تھا! مجھے ہسپتال میں پرائے لوگوں کے حوالے کر کے چلا گیا۔ کہاں گیا، مجھے کچھ نہیں معلوم؟"

"لیکن یہ سب کچھ تم کو کس نے بتایا؟"

"میں ابھی چھوٹا سا تھا۔ تین چار برس کا ہوں گا، کہ ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست ان سے ملنے آگئے۔ میں ڈاکٹر صاحب کی گود میں تھا اس نے مجھے پیار کیا اور ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"یہ وہی بچہ ہے نا؟ تم بہت اچھے انسان ہو ڈاکٹر، دیکھو اس پرائے بچے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھ کر پال رہے ہو؟"

اس پر اباجی نے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے گود سے اتار کر کہا۔

"جاؤ بیٹے باہر کھیلو!"

میں باہر جا کر دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اباجی اس دوست کو بتا رہے تھے۔

"یہ بچہ نہیں جانتا کہ یہ ہمارا اپنا بیٹا نہیں ہے۔ اس کے سامنے ایسی باتیں مت کرنا۔ یہ کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"پھر تم نے ان سے نہیں پوچھا کہ تم دراصل کون ہو؟"

زیبو نے سوال کیا۔

"کئی بار ارادہ کر چکا ہوں کہ ان سے اپنے بارے میں پوچھوں کہ میں کون ہوں؟ لیکن ان کے بے انتہا پیار، خلوص اور محبت کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہوں۔ اب میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا ہوں کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کیوں ہوں؟"

جاوید خاموش ہو گیا۔ زیبو بھی چپ سادھے جاوید کو تکتی رہی۔

کمرے میں خاموشی کی دبیز چادر بچھ گئی تھی۔ دونوں صرف اپنے اپنے سانسوں کی آواز سن رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ گویا ہوا۔

"اور اب تو مجھے ان لوگوں نے اور بھی بے بس کر دیا ہے؟ جب سے مجھے یہ پتہ لگا ہے کہ ان کی تمام جائیداد کا میں واحد مالک ہوں اور مجھے اپنا وارث بنا گئے ہیں تو خود کو ایک ایسا قیدی محسوس کرنے لگا ہوں جو کوئی جرم کئے بغیر عمر قید کاٹ رہا ہو؟ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے زیبو! یہ سب جھوٹ ہے۔

لم ہے!"

جاوید بڑا جذباتی ہو چکا تھا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی چیخ چیخ کر بلک بلک کر رو پڑے گا۔ لیکن اس نے جلدی اپنے اوپر قابو پالیا۔

"ہاں زیبو! یہ ظلم ہے، کوئی جرم کئے بغیر میں قید کاٹ رہا ہوں، میری زندگی جہنم بن چکی ہے؟ میری زندگی اب میری اپنی تلاش کا نام بن چکا ہے۔"

"تو کیا تم یہ وثوق سے کہتے ہو؟ کہ جو کچھ تم نے سنا ہے وہ سچ ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم نے کوئی خواب دیکھا ہو اور اسے سچ سمجھ بیٹھے ہو؟"

"ہاں خواب ہی دیکھا تھا! لیکن میری زندگی کا یہی ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر سچی نکلی۔"

اور پھر جاوید نے زیبو کو بتایا کہ جن دنوں زیبو نے نامکمل شخصیت والی بات کی تھی، تب سے جاوید کی طبیعت میں ایک طرح کی بے چینی آگئی تھی۔ اس کو کہیں بھی قرار نہیں آرہا تھا۔ ایک دن اسی طرح گھر میں کسی کو پتہ دیئے بغیر ہی وہ اپنے کمرے میں آکر لیٹا تھا۔ اس وقت اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ لیکن کھڑکی کی دوسری طرف ہونے والی باتوں کی آواز اُس کے کانوں میں صاف پڑ رہی تھی۔ وہ اس کھڑکی کے اور نزدیک کھسک گیا جو بہت عرصہ ہوا بند تھی اور جو اس کے کمرے سے ماں باپ کے بیڈ روم میں کھلتی تھی۔ امّی کی آواز آرہی تھی۔

"چند روز سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ بجھے بجھے سے نظر آرہے ہیں؟"

"ہاں ہما؟ وہ بڑے کیا کہتے ہیں کہ جسم پر کبھی دل کی بادشاہت

ہوتی ہے اور کبھی پھیپھڑوں کی۔ جب دل کی حکمرانی ہو تو تمام جسم خوش ہوتا ہے، ذہن بھی اچھی خوشگوار باتوں کو سوچا کرتا ہے اور جب بادشاہت پھیپھڑوں کی ہو تو معاملہ الٹ ہوا کرتا ہے۔ لگتا ہے میرا جسم آجکل پھیپھڑوں کے حکم کے تابع ہے۔"

"زیبو یاد آرہی ہے؟"

"نہیں تو، پرسوں ہی تو اسے ملا ہوں، بتایا تو تھا تمہیں۔"

"طبیعت تو ٹھیک تھی نا اس کی! ماں باپ تو بڑے خوش ہوں گے۔ کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ!

"ہاں لائق اور ذہین اولاد بھی خدا کی ایک نعمت ہوتی ہے۔"

"جاوید کا خیال ہے کہ اب اسے کالج میں باقاعدہ داخلہ لینا چاہیئے۔"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیوں؟ تمہاری مرضی نہیں ہے کیا؟"

ہُما نے کسی قدر شک سے پوچھا۔

"میں نے ہی تو زیبو کو آگے پڑھانے کی تجویز پیش کی تھی۔ جو تجویز نہیں تھی بلکہ زیبو کی بیماری کا علاج ہی یہی تھا۔"

ڈاکٹر پھر خاموش ہوگیا۔ وہ سوچوں میں گم تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہما بولی:

"کیا سوچ رہے ہو، جاوید کے ابا؟ کوئی ایسی بات ہے کیا جو مجھ سے چھپا رہے ہو؟"

ڈاکٹر نے ایک گہرا سانس لیا۔

"ہاں ہما۔ یہ سوچ رہا ہوں کہ جس ڈاکٹر نے تمام زندگی دوسروں کے جسم اور ذہن سے بڑی کامیابی سے بیماریوں کی جڑیں تک اکھیڑیں، جس نے اتنے سارے لوگوں کی مسیحائی، وہ خود کس

بے نام مرض کا شکار ہوگیا ہے ؟"

ڈاکٹر بڑے جذباتی لہجے میں بول رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر بے چینی سے ٹہل رہے ہیں۔ امی اس وقت کیا کر رہی تھیں یہ دیکھنے کے لئے میں نے اُٹھ کر کھڑکی کی کسی درز سے دیکھنے کی کوشش کرنا چاہی لیکن اتنی بے باکی مجھے اچھی نہ لگی اور میں یونہی دم سادھے صرف کان لگائے سُنتا رہا۔

امی کی ہنسی کی آواز آئی۔

"کیا اس بڑھاپے میں کسی حسینہ کے دامِ الفت میں پھنس گئے ہو کہ ۔۔۔۔؟"

"ہاں ہما، یہ ایک ایسا دام ہے، جس میں میرا ذہن پھنس چکا ہے۔ میری سوچیں تھک کر شل ہو چکی ہیں۔ شاید اب مستقبل کی طرف ایک قدم بھی آگے بڑھانے کی سکت مجھ میں نہ ہو!!"

"دیکھو جاوید کے ابا ایف، آر، سی، ایس اور نفسیات کی ڈگریاں تم نے لی ہیں۔ میں ایک سیدھی سادھی میٹریکولیٹ لڑکی تھی۔ شادی کے بعد بہت کچھ تم سے سیکھا۔ لیکن باتوں کی یہ معما بازی کا سبق تم نے مجھے کبھی نہیں پڑھایا۔ اس لئے جو کچھ کہنا ہے سادہ الفاظ میں بیان کرو!"

"میں یہ سوچا کرتا ہوں کہ باہر کی دنیا کے نفسیاتی مریضوں کا علاج تو کرتا ہوں، وہ پوری طرح شفایاب بھی ہو جاتے ہیں اور اپنے گھر میں مریض نظر نہیں آ رہا ہے ؟"

"کونسا مریض ؟" ہما نے حیرانی سے پوچھا۔

"جاوید!" ڈاکٹر کا مختصر جواب تھا۔

"جاوید کو کیا ہوا؟"
ہُمانے گھبرا کر پوچھا۔
"دیکھتی نہیں ہو؟ چند روز سے کھویا کھویا سا رہتا ہے"
"لڑکا ہے، جوان ہے، ہو سکتا ہے کہ...."
ہُما نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"اگر تمہارا اشارہ زیبو میں جاوید کی دلچسپی لینے کی طرف ہے تو وہ تو اتنی مشکل بات نہیں ہے لیکن ۔ مجھے تو یوں لگتا ہے، جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ ۔"
"کہ جاوید ہماری اپنی اولاد نہیں ہے؟"
ہُما جلدی سے بولی۔
"ہاں"
"یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟"
ہُمانے گھبراہٹ اور شکوک کے ملے جلے اثر تلے کہا۔
"میں مدتوں سے جاوید کی خصلت کو جانچ رہا ہوں۔ اس کی ہر حرکت اپنی عقل کے ترازو سے تول رہا ہوں اور اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ جاوید کا رویہ ہمارے ساتھ اپنی اولاد جیسا نہیں ہے؟"
"یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ ۔ جاوید جیسا فرمانبردار، نیک، کم گو اور معصوم لڑکا تو اس دنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو؟"
ہُما پہلو پہ پہلو بدلتی رہی ۔ اس کے لہجے سے پیار، خلوص، معصومیت اور والہانہ پن عیاں تھا ۔ وہ جاوید پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں پڑنے دے رہی تھی ۔ ڈاکٹر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"اس کی یہی عادات تو میرے شک کو یقین میں بدل رہی ہیں

تاکہ اس کا ہمارے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اپنے حقیقی بیٹوں جیسا نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ بدزبان ہوتا۔ بدتمیز ہوتا، سرکش ہوتا، نافرمان ہوتا، تب تم اسے اپنا بیٹا تسلیم کرتے اس کی عادتیں تو بچپن ہی سے ایسی تھیں۔"

ہما سراپا احتجاج تھی۔

"اپنے حقیقی بیٹے کی حیثیت سے اسے ہمارے ساتھ، کبھی کبھار ایسا رویہ ضرور اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ اسے بچپن ہی سے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرنی چاہیئے تھی جو تم کو غصہ دلاتی۔ جو مجھے ناراض کرتی۔ شروع شروع میں تو میرا خیال تھا کہ قدرتی طور پر غبی ہوگا، جو ہماری آنکھ کے اشارے کا منتظر رہتا ہے لیکن تعلیمی میدان میں اس کی شاندار کامیابیوں نے مجھے یہ تجزیہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ یہ بچہ کسی اچھے اور پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔"

"دو نا۔۔ تو اتنی مدت بعد تم کو یہ خیال کیسے آیا؟ کہیں وہ چور کی داڑھی میں تنکا والی بات تو نہیں ہے؟"

ہما نے بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

"ہاں ۔۔ ایسا ہی سمجھو، لیکن یہ تنکا اب تنکا نہیں رہا بلکہ آنکھ کا شہتیر بن چکا ہے، چوری سدا چھپی نہیں رہتی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی صورت میں ایک نامعلوم زبان سے چوری ایک دن اپنا حال خود ہی سنا دیتی ہے!"

ڈاکٹر بڑا سنجیدہ تھا، وہ بے قراری سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں پیچھے کو بھنچی ہوئی تھیں اور وہ بار بار اندر سینے میں ابلنے والا لاوا منہ کے ذریعے ہوا کی صورت میں نکال رہا تھا،

جسے ٹھنڈی آہیں بھرنا بھی کہا جاتا ہے۔

"یہ وہم آپ کو کیسے دامن گیر ہوا؟"

ہُما نے اپنے آپ کو مزید یقین دلانے کی خاطر پھر پوچھا۔

"تم نے یہ بات نوٹ نہیں کی تھی کہ جس روز زیبو دہ پرورش اور تربیت والی بات پر بحث کر رہی تھی تو جاوید نے کتنی دلچسپی دکھائی تھی اور تب سے میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ کچھ کھویا کھویا سا، کچھ گھبرایا سا، مارا مارا سا، اِدھر اُدھر، بے مقصد پھرتا رہتا ہے جیسے اس کا کچھ کھو چکا ہو؟ وہ کچھ ڈھونڈ رہا ہو؟ کسی چیز کی تلاش میں ہو اور وہ اسے نہ مل رہی ہو؟"

ڈاکٹر بڑے ہی اُداس لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کے بولنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کو جاوید کے ساتھ کتنی ہمدردی ہے۔

ہُما بھی اب حقیقت کا سامنا کر رہی تھی۔ وہ کچھ بجھ سی گئی تھی، اس کے لہجے میں مایوسی در آئی تھی اور جاوید کے ساتھ باندھے ہوئے برسوں پرانے رشتے کے بل آہستہ آہستہ کھل رہے تھے اور ہُما کی گرفت اس پر سُست پڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گویا خود سے ہمکلام تھی۔

"جانے اُسے کس نے یہ بتایا ہوگا کہ وہ کسی اور کا بیٹا ہے! اس کی ماں جب ڈلیوری کے وقت مر گئی تھی اور تم مری ہوئی ماں کا پیٹ چاک کر کے اُسے اس دنیا میں لے آئے تھے اور پھر تم نے منہ کے ذریعے اس کے نیم مُردہ جسم میں اپنی سانس پھونک کر اُسے زندگی بخش دی تھی اور جب اس کے والد کو پتہ چلا تھا کہ اس کی بیوی مر چکی تو وہ بچہ ہسپتال والوں کے سپرد کر کے خود اپنے چھ اور معصوم بن ماں کے بچوں کو لے کر روتا دھوتا مشکل سے ہسپتال سے چل پڑا تھا اور پھر یہ بچہ تم کو دیا گیا کہ تم لاولد تھے، تمہاری بیوی بانجھ تھی۔"

"ہاں ہما، اور اسی خلا کو پُر کرنے کے لئے اپنی اولاد سمجھ کر پالنے لگے۔ پھر اس ڈر کے مارے کہ مبادا جاوید کے کان میں یہ بھنک پڑ جائے کہ وہ پرائی اولاد ہے، ہم کراچی چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ میں نے سرکاری نوکری سے بھی استعفیٰ دے دیا اور اپنی طرف سے، ماضی کے تمام بندھنوں سے ناطہ توڑ کر پشاور میں جاوید کے ماں باپ بن کر نئی زندگی کا آغاز کیا۔"

ڈاکٹر کے ذہن میں بھی سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔

"اللہ کرے یہ وہم ہو!"

ہما خلاؤں میں گھورتی ہوئی کہیں دور نکل گئی تھی، ڈاکٹر نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر ایک گہرا سانس لیا۔

"اچھا میں تو باہر چلا، تم کو اگر کچھ منگوانا ہو تو اسلم ماما کو پیسے دے کر منگوا لو۔ آج میں یہ ڈیوٹی ادا نہیں کر سکوں گا۔"

"مجھے کچھ نہیں منگوانا، سب کچھ کل منگوا لیا تھا، موسم خراب تھا، مجھے اندازہ تھا تم نہ جا سکو گے۔ ہاں سچ! جاوید کو اپنے لئے کچھ چیزیں خریدنی ہیں اُس کے ساتھ بازار جاؤ گے؟"

"چیزیں اُسے خریدنی ہیں، پیسے پاس ہوں گے! تھوڑے ہوں تو اور دیدینا۔ میں موٹر نہیں لے جا رہا ہوں، حمد خان کو بھی ساتھ لے لے اور دونوں گاڑی میں جا کر خود خرید لو۔ اب اس کو ہمارا سہارا نہیں چاہیئے۔ اسے اب اپنے آپ سے کام کرنا ہوں گے ہم سے صرف مشورہ کیا کرے گا اور کچھ نہیں۔"

ہما کو پھر کچھ یاد آیا، وہ پھر کچھ بھول گئی اُسے خلاؤں میں گھورتے ڈاکٹر نے دیکھ لیا تھا، وہ باہر جاتے جاتے ذرا رُکا۔ ہما خود کلامی کے سے انداز میں گویا تھی۔

"وہ تو اپنی مرضی سے کبھی کوئی چیز نہیں خریدتا۔ ٹائی اور جراب تک تمہاری پسند کی تم سے پوچھ کر خریدتا ہے۔ شاید۔ شاید تمہارا وہم درست ہے! شاید جاوید سب کچھ جانتا ہے۔"

"اب آیا یقین؟"

"ہاں ـــ اب آیا یقین کہ قدرت نے مجھ سے تخلیق کی طاقت چھینی ہوئی ہے۔ میں ماں کیسے بن سکتی ہوں! میں نامکمل عورت ہوں ـــ میں ـــ میں جاوید کی اپنی ماں نہیں ہوں۔ میں نے جاوید کو جنم نہیں دیا ہے۔ جاوید میرا اپنا بیٹا نہیں ہے۔"

ڈاکٹر ہما کو اپنے حال پر چھوڑ کر باہر نکل گیا کہ اس وقت اُس کا نفسیاتی مطالعہ بھی فیل ہو رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہما سے کہے تو کیا کہے؟

"تو اب کیا ارادے ہیں؟" زیبو نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے جاوید سے جاوید کی کہانی سُن کر پوچھا۔

جاوید خاصا تھکا ہُوا سا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور زیبو سے نظر ہٹا کر بڑے ہی آرام سے دھیمے لہجے میں بولا۔

"بس ـــ تمہاری جو تصویر ذہن میں بنا چکا ہوں، اُسے ذہن ہی میں رہنے دیتا ہوں اور دل پر ایک بھاری پتھر رکھ لیتا ہوں۔"

زیبو کا منہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ جاوید ہنس پڑا۔

"اور ہاں سچ ـــ مزید یہ کہ تمہاری طرف سے تمہارے نئے گھر کی دعوت کا منتظر ہوں کہ ....."

جاوید پر پھر سنجیدگی طاری ہو گئی لیکن اس نے بالکل بے جان

سے الفاظ سے یہ آخری جملے پورے کئے۔

"۔۔۔۔۔ پھر دیکھتا ہوں کہ تمہیں دل میں جگہ دوں یا ذہن ہی میں رہنے دوں۔"

"میں تو سمجھ رہی تھی، تم میری شادی کی بات سُن کر اُداس ہو جاؤ گے!"

"شادی کا مطلب ہے خوشی اور کسی کی خوشی پر میں اُداس کیوں ہونے لگا؟"

جاوید نے زہر خند سے بات مذاق میں ٹالنی چاہی۔

"جاوید تم سچ مچ بہت خوش ہو؟"

"اگر خوش نہیں ہوں تو تم ایسا سمجھ لو۔"

زیبو نے ایک ٹھنڈی آہ کو سینے کے اندر ہی دبا یا اور اُسے لگا کہ اس کا آخری سہارا بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

"اچھا! آؤ اب ناشتہ کرتے ہیں۔ یہ میری تمہارے گھر میں آخری چائے ہو گی۔"

"تو کیا امتحان نہیں دینا؟"

"میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونا نہیں چاہتی۔"

"تو فسٹ ڈویژن لے لو۔"

"ذہن کام نہیں کرتا۔"

جاوید نے پھر ایک بے مقصد سا قہقہہ لگایا۔

"اچھا۔ آؤ۔ چائے پیتے ہیں، ذہن کام کرنے لگے گا۔"

زیبو نے بھی زہر میں بجھی ہوئی ہنسی کے فوارے چھوڑے۔

جمعہ کا مبارک دن تھا، مہرو فجر کی نماز پڑھ کر ابھی جائے نماز سے نہیں اُٹھی تھی، وہ تسبیح پھیر رہی تھی، قرآن پاک جو بستر کے سامنے بنائے گئے طاقچے میں رکھا تھا۔ اس طاقچے میں کچھ پارے بھی پڑے رہتے تھے اور ساتھ ہی رحل بھی۔ پارے فارم میں کام کرنے والے بچے اور لڑکیاں پڑھا کرتی تھیں۔ مہرو اور زیبو فارغ اوقات میں گاؤں کی ان عورتوں کو بھی قرآن پاک پڑھاتی تھیں جو بچپن میں اس سعادت سے محروم رہ گئی تھیں۔

زیبو نماز سے فارغ ہو کر فارم کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ بی اے کا امتحان دے چکی تھی اور اب اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ عنایت اللہ خان نے کریم خان اور مہرو کے آگے ہتھیار تو ڈال لئے تھے لیکن وہ اپنی اس بات پر اڑے رہے کہ زیبو امتحان ضرور دے گی۔

امتحان ختم ہوئے دوسرا دن تھا اور آج سے پورے دس دن بعد شادی ہونی تھی۔ آج جمعہ کا مبارک دن تھا اور مہرو نے آج ہی سے گھر کی دو تین خادماؤں، زیبو کی بیوہ پھوپھی

شہر بانو اور نائن پری کو ساتھ لے کر اسے (بلاوا) پر نکلنا تھا اور سب سے پہلے گاؤں کے مشہور سید خاندانوں کے محلے پیران گڑھی میں جا کر پہلے بڑے پیر صاحب کے گھر جانا تھا پھر دور و نزدیک کے رشتہ داروں کے ہاں۔

عام طور پر گاؤں کی سیدانیاں خود آتی لوگوں کی شادی بیاہ میں شرکت نہیں کرتیں بلکہ اپنی جگہ گھر کی کوئی خادمہ بھجواتی ہیں اور خادمہ کی اتنی ہی آؤ بھگت ہوتی ہے، جتنی کسی خاندانی عزت دار عورت کی۔

چونکہ گاؤں کے رہنے والوں کے رشتے ناطے دوسرے دیہات سے بھی ہوا کرتے ہیں اور شادی غمی میں ان کی شرکت لازمی ہوتی ہے اس لئے صدتے پر گھر کی عورتیں دس پندرہ روز پہلے ہی نکل جاتی ہیں۔ صبح سے شام تک ایک ایک گھر میں گھنٹہ دو گزارتی ہیں۔ کسی نے چائے پلائی، کسی نے شربت کھانے کا وقت ہوا تو کھانا کھلایا گیا۔ کھانے کے وقت کسی قریبی عزیز رشتہ دار کا گھر چُنا جاتا ہے کیونکہ ایک پشتون جتنا کسی مہمان کو کھلانے سے خوش ہوتا ہے، اتنی خوشی اُسے دوسروں کا مہمان بن کر نہیں ہوتی اور حتے الوسعے کوشش کرتا ہے کہ خواہ مخواہ کسی پر بوجھ نہ بنا رہے حالانکہ وہ خود سدا اپنے وقت کے مہمانوں کا منتظر رہتا ہے۔

مہرو نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد ناشتہ ... گھر سے نکلنے کا پروگرام بنایا تھا وہ کب سے بلانے ... پری اور شہر بانو کا انتظار کر رہی تھی۔

مہرو نے ابھی مشکل سے تسبیح کے دو تین پھیرے پورے کئے ہوں گے کہ طلائے چیختی چلاتی، بھاگی بھاگی آتی دکھائی دی۔

"بی بی! ـــ اے بی بی ـــ بڑی بی بی پکڑ کر لے گئے۔ سب کو لے گئے ـ پولیس ہے، تھانے دار ہے، بی بی! ـ غرق ہو گئے!"

مہرو جوتا پہنے بغیر جائے نماز سے اتری اور دوڑتی ہوئی اس کی طرف گئی۔ جونہی طلائے کی نظر گھبرائی ہوئی مہرو پر پڑی اس نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔

"بی بی! ـ غرق ہو گئے۔ تباہ ہو گئے ـ ہائے اللہ یہ کیسی شرمندگی ہے ـ یہ کس گناہ کی سزا مل رہی ہے؟ میری فرشتہ زیبو بی بی ـــ یہ کیا ہو گیا؟"

مہرو ساتھ ساتھ پوچھتی بھی رہی، اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہوش میں لاتی بھی رہی ـ لیکن طلائے پر ہذیانی کیفیت طاری تھی ـ

"بیڑا غرق ہو؟ کچھ تو بتاؤ کیا ہو گیا؟ کس کو لے گئے؟ کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"ہائے اللہ شکر ہے خان بابا خود آ گئے ـ میرے منہ میں خاک! میں کس طرح شفیق خان کا نام لے سکتی ہوں!"

اور مہرو اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئی۔ عنایت اللہ خان گھر میں گھستے کے ساتھ ہی طلائے پر برس پڑا ـ

"ذرا آہستہ بولو، کیا غضب ڈھا رہی ہو ـ یہ اِرد گِرد کے لوگ کیا کہیں گے؟"

"خان بابا لوگ کہاں ہیں؟ مجھے سُننے کو! سب بھاگ کر

چلے گئے ہیں کیا مرد ؟ کیا بچے کیا عورتیں ؟ بی بی جی! سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا ہے "۔

"کیا بک رہی ہو ؟ زیبو کے ابا تم کچھ بتاؤ ؟ کیا آفت آپڑی کیا ہوا ؟"

اور عنایت اللہ خان نے بیوی کو بڑے رازدارانہ لہجے میں بتایا کہ صبح کی اذان سے کچھ دیر پہلے اس کے بھائی کریم خان کے گھر پر پولیس کا چھاپہ پڑا ہے۔ شفیق، مدو، صنل اور ذہین خان کو پکڑ کر لے گئے ہیں اور شاید کریم خان کو بھی اب تک ہتھکڑی لگا دی گئی ہوگی۔ کیونکہ جب چھاپہ پڑا تھا تو کریم خان باہر کھیتوں میں تھا۔ رات اس کے پانی کی باری تھی۔

"یہ چھاپہ کیوں پڑا ؟"

"شفیق ایک بڑا سمگلر تھا۔ کچھ سامان پکڑا گیا ہے۔ ساتھ ٹرک اور موٹروں پر بھی پولیس نے قبضہ کر لیا ہے۔ پولیس بڑی مدت سے پیچھے پڑی تھی۔ جاؤ برقعہ لو اور بھائی کے گھر چلو! بھاوج کو کچھ تسلی ہو جائے گی۔ میں تم کو بتانے آیا تھا۔ اب وہیں واپس جا رہا ہوں "۔

"زیبو کے ابا تم مت جاؤ، تمہیں بھی پکڑ لیں گے! آخر کو تمہارا تایازاد ہے "۔

"تم جلدی کرو، دیر مت لگاؤ، سب دُنیا اکٹھی ہو گئی ہے بُری بات ہے، ایک تو خدا کے یہ بندے بھی عجیب تماش بین ہیں، ذرا کسی پر مصیبت ٹوٹی اور ان کے ہاتھ آ گیا بس ایک تماشہ!"

"جو تماشہ بنتے ہیں، ان کا تماشہ کیا ہی جاتا ہے ؟ نہ کرتے

تماشے والا کام، نہ ہوتا آج یہ انجام " مہرو کا لہجہ بالکل بدل چکا تھا۔

"تم اپنی منطق بعد میں بگھارنا۔ پہلے جاؤ برقعہ اٹھالاؤ، بُری بات ہے بھتیجا پکڑا گیا ہے، شاید بھائی کو بھی پکڑ کر لے گئے ہوں۔ بھاوج بیچاری اکیلی رہ گئی اس کو تسلّی دیدو گی، چلو نا۔"

عنایت اللہ خان کچھ سمجھانے کے انداز میں، کچھ غصّے

میں بولا۔ لیکن مہرو ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ لاپرواسی ہو کر چارپائی پر آرام سے بیٹھ گئی۔ عنایت اللہ کو مہرو کی اس ادا پر حیرت بھی ہو رہی تھی، غصہ بھی آرہا تھا اور خوش بھی ہو رہا تھا۔ لیکن ان کی ملازمہ طلئے کی حالت غیر ہو رہی تھی، مہرو اپنے شوہر کے سمجھانے پر بھی نہ سمجھی اور اکڑ کر بولی۔

" میں تو کبھی بھی نہ جاؤں! جائیں بھاڑ میں بھتیجا اور اس کے ماں باپ۔"

"بی بی! بُری بات ہے، دیکھو چند روز میں داماد بننے والا ہے تمہارا"، طلئے التجا کر رہی تھی۔ مہرو غصّے میں بپھری۔

"میرا کوئی داماد نہیں ہے؟ شکر ہے میری جوز بیٹی کو اس شیطان صفت انسان سے بچایا۔ ورنہ میری زیبو تو تباہ ہو گئی ہوتی۔"

اُس نے زیبو کو سینے سے لگایا۔

"بس، میں نے سارے رشتے ناطے توڑ دیئے، نہ میں کسی کی کچھ لگتی ہوں، نہ میرا کوئی کچھ لگتا ہے۔"

زیبو گھر میں اچانک ہونے والے ہنگامے کا سا سماں بندھا دیکھ کر بھاگی ہوئی آئی تھی اور اب سہمی ہوئی چپ چاپ ایک طرف کو کھڑی تھی۔ جب ماں نے اسے سینے سے لگایا تو اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ بلکہ ایک بے جان کپڑے کی بنی گڑیا کی طرح دونوں ہاتھ لٹکائے ماں کے سینے کے ساتھ لگی رہی اور جب مہرو نے اسے اپنے سے جدا کیا تو زیبو میں اتنی جان بھی نہ تھی کہ وہ اپنے پیروں پہ کھڑی رہ سکتی۔ وہ ساتھ ہی پڑی ہوئی چارپائی پہ بیٹھ گئی، اس کا رنگ فق تھا، ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے اور اس کا سارا جسم مکڑی کے جالے کے تار کی طرح کانپ رہا تھا۔

"بے بے! برقعہ لو ــــ اور چلی جاؤ ــــ رشتے کسی کے کہنے سے ــــ اس طرح نہیں ٹوٹا کرتے ــــ"

زیبو کے مردہ جسم سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے؟

شفیق کے پکڑے جانے اور شادی کے رکنے کی خبر "جاوید ولا" بھی پہنچ چکی تھی ــــ ڈاکٹر عبدالمجید اور اس کی بیوی ہما افسوس کے لئے عنایت اللہ کے گھر آئے ہوئے تھے۔ ہما کی طبیعت کچھ ناساز سی لگ رہی تھی۔ وہ باتوں میں زیادہ حصہ بھی نہیں لے رہی تھی۔ بلکہ ایک طرف کو خاموش لیٹی ہوئی تھی مہرو نے سمجھا تھا کہ شاید اس کے گھرانے کے اتنے بڑے واقعے کا اسے دلی رنج ہوا ہے۔ زیبو بھی ایک طرف کو ہو کر بیٹھی تھی، اس کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی تھی کہ گاؤں کے رواج کے مطابق لڑکی کو شادی سے مہینہ بھر پہلے عزیز و اقارب مہمان بنا کر اپنے گھر ٹھہراتے۔

ہیں اور اس کے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگانا ہر میزبان
اپنا فرض سمجھتا ہے، کیونکہ اسے اس خوشی کے مبارک موقعہ پر
اپنے دلی جذبات کے اظہار کا یہی ایک سہل طریقہ نظر آتا ہے۔
لیکن زیبو کے امتحان کی وجہ سے تمام قریبی رشتہ دار یہ خوشگوار
فریضہ پورا تو نہیں کر سکے تھے کہ اب شادی میں صرف چند روز
باقی تھے مگر مہندی اور کھانے پینے کے خوان مہرو کے گھر بھجواتے
رہے اور ساتھ ہی اس خواہش کا اظہار بھی ہوتا رہا کہ زیبو کو
مہندی ضرور لگوائی جائے اور اسی لئے دو تین روز سے متواتر
زیبو کے ہاتھوں پیروں میں مہندی رچتی رہی ۔ یہ فرض دل
افروزہ انجام دیتی تھی ۔

ہما نے زیبو کے مہندی لگے ہاتھ پاؤں دیکھے لیکن اس پر
کوئی تبصرہ نہ کیا کہ موقعہ ہی ایسا تھا ۔ لیکن ڈاکٹر کو پتہ تھا کہ بات
دراصل کچھ اور تھی ۔

عنایت اللہ خان نے ہما بھابی کی بے اعتنائی کی وجہ یہ سمجھی
کہ شاید وہ اپنے بیٹے جاوید کے لئے زیبو کے لئے رشتے کی
خواہش مند تھی اور یہ تھی بھی حقیقت لیکن اس کا اظہار اس
نے کبھی بھی برملا نہ کیا تھا اور شاید اسی لئے اس کو اس کا
ملال تھا ۔

شفیق کو عمر قید ہو چکی تھی ۔ وہ اسمگلنگ کے جرم میں سات
سال اور آج سے ڈیڑھ دو برس پہلے پولیس کے ساتھ ایک
جھڑپ میں ایک سپاہی کی موت کے الزام میں چودہ سال قید
بامشقت کا سزاوار ٹھہرایا گیا تھا ۔ کریم خان ہر الزام سے بری
قرار دیا جا چکا تھا ۔ لیکن دم ملنے ملانے والوں سے منہ چھپاتا پھرتا

مخاطب کیا لیکن دراصل وہ بات زیبو کے کانوں میں ڈالنا تھا اور گھر میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ اب اس کا حجرہ اس کے دامادوں کے رحم و کرم پر تھا اور اب وہی اسے چلا رہے تھے۔ یہی حال اس کی زمینوں کا بھی تھا۔

یہ سب باتیں عنایت اللہ ڈاکٹر کو آہستہ آہستہ بتلا رہا تھا۔ باتوں کے دوران وہ دونوں کبھی کبھار زیبو کو بھی دیکھ لیتے تھے۔ جو اب ایک طرف کو بیٹھی خادماؤں کی مدد سے ہانڈیوں سے سالن نکال نکال کر کھانے کی میز پر پہنچا رہی تھی۔ کھانا کھانے سب لوگ بیٹھ چکے تھے۔

شفیق پھر سے باتوں کا موضوع بن چکا تھا۔ لیکن زیبو اور ہُما دونوں نے ان باتوں میں دلچسپی دکھائی اور نہ ہی کوئی حصہ لیا۔ اور جب وہ لوگ چلے گئے، تو مہرو نے بظاہر شوہر کو چاہتی تھی۔

" ہُما بھابی زیبو کی شادی کی خبر سے بڑی ہی ناراض لگ رہی تھی۔ اُسے زیبو بہت پسند ہے۔ شادی رُک جانے سے اب خوش ہو گئی ہوگی۔ لیکن اس نے جان بوجھ کر بتلایا نہیں اور میں نے بھی عمداً نہیں بتایا کہ شادی رُک گئی ہے۔ بلکہ اب تو سہرے سے وہاں ہو گی ہی نہیں "

عنایت اللہ خان نے ایک سرد آہ بھری لیکن خاموش رہا۔

" مجھے بھی جاوید اچھا لگتا ہے۔ ہماری زیبو کے ساتھ تو بس وہی سجتا ہے — خوبصورت — نیک لائق، فائق۔ اور اب تو فوج میں، ہُما بھابی بتلا رہی تھیں کپتان ڈاکٹر لگ گیا ہے "

مہرو اپنی ترنگ میں بولتی گئی — اس پر عنایت اللہ خان

آہستہ سے بولا۔

"قدرت کے کھیل نرالے ہیں - میں نے کب شفیق کو دل سے داماد مانا تھا!"

"بس اگر ڈاکٹر بھائی کے گھر والوں نے صرف اشارہ بھی کیا، تو میں اسی وقت حامی بھر لوں گی اور چند روز میں ڈولی دیدوں گی۔ جہیز تو ویسے بھی سارا تیار پڑا ہے، چاول، گھی وغیرہ بھی آچکے ہیں۔ بلکہ مہندی تک گھر میں موجود ہے"

"ڈاکٹر بھائی کی باتوں سے میں ——— تو ——— کوئی خاص اندازہ نہ لگا سکا۔ ہاں اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو مجھے بھی راضی ہی سمجھو۔"

زیبو جو بظاہر ان کی باتوں سے بے نیاز تھی۔ ماں باپ کا ہر لفظ بڑے غور سے اور توجہ سے سُن رہی تھی تھوڑی دیر بعد وہ آہستہ سے اُٹھ کر ماں باپ کے قریب آ گئی۔

"داجی، منڈی میں ایک بار بِکا ہوا ڈنگر بار بار نہیں بیچا جاتا ——— میرا اصلی مالک مجھے لینے آئے تو میری رسّی کھونٹے سے کھول کر اسی کے ہاتھ میں تھما دینا کہ میں اسی کی ملکیت ہوں"

مہرو نے یہ سُنا تو اٹھ کر زیبو کو گلے لگایا اور رونا شروع کر دیا۔ لیکن زیبو نے رونے میں ماں کا ساتھ نہ دیا۔ عنایت نے اپنی جگہ سے بڑی مشکل سے اُٹھ کر زیبو کے سر پر ہاتھ رکھا اور اثبات میں سر ہلاتا ہوا، عصا ہاتھ میں لے کر، پگڑی سر پر رکھ کر باہر کی طرف چل پڑا۔

جاوید ابھی چھوٹا ہی تھا کہ باپ اس کو تاریخ اسلام اور تاریخ آزادی کے قصے سنایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر کو چونکہ انسانی نفسیات سے دلچسپی تھی، اس لئے وہ جاوید کی نفسیات کا بھی مطالعہ کیا کرتا تھا اور مختلف مضامین کے بارے میں قصے کہانیوں کی صورت میں جاوید کو معلومات بھی بہم پہنچاتا تھا۔ ڈاکٹر نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ جاوید کے سینے میں ایک دردمند دل دھڑک رہا ہے اور اسے دکھی انسانیت سے بے انتہا محبت ہے۔

" اباجی وہ نائٹ انگیل اور زخمی کتے کی کہانی تو ذرا سنائیں، وہ جو فلورنس نے اس زخمی کتے کی مرہم پٹی کی تھی اور اس کی زخمی ٹانگ ٹھیک ہو گئی تھی اور پھر کتے نے پیار میں اس کے ہاتھ چاٹے تھے "

ایسے موقعوں پر اکثر اس کی ماں کہہ دیا کرتی۔

" چھی چھی، گندی حرکت — کتا ہاتھ چاٹے اور ہمارے بیٹے کو اچھا لگے "

" نہیں امی — کتے کو بولنا جو نہیں آتا نا۔ بس وہ چاٹ کر خوشی دکھاتا ہے "

اس پر ڈاکٹر کہتے۔

"ہاں بیٹا! تمام مخلوق پیار اور خدمت سے خوش ہوتی ہے۔ ہمارا بیٹا بھی لوگوں کی خدمت کیا کرے گا۔ ہے نا!" "جی ہاں ابا جی ۔۔۔"

"اور جاوید کے ابا ۔۔ جاوید کو وہ حضرت بی بی رابعہ بصریؒ والی کہانی سنائیے ۔۔ وہ جو پیاسی کتیا کو پانی پلاتی ہیں"

اور جاوید کہتا "ہاں ابا جی! ۔۔ امی اس کہانی سے بہت خوش ہوتی ہیں۔ اس کتیا سے جو حضرت بیؒ بی کے ہاتھ نہیں چاٹتی ۔"

"ہاں بیٹا! تو کہانی یہ ہے کہ ایک کتیا پیاسی تھی، کنوئیں کے کنارے اس نے بچے دیئے تھے، حضرت بی بی رابعہ بصریؒ نے دیکھا، ان کو پیاسی کتیا پر بڑا ترس آیا۔ انھوں نے کتیا کو پانی پلانا چاہا۔ کنوئیں پر ڈول نہیں تھا"

"ہاں ابا جی ۔ تب ہی تو کتیا بیچاری پانی نہیں پی سکتی تھی" جاوید معصومیت سے کہتا ۔۔ اس پر ماں باپ دونوں ہنس پڑتے ۔

"ہاں بیٹے! یہ کام تو انسان کا ہے نا ۔ کہ سوچ کر کام کرتا ہے ۔۔ تو ۔ کنوئیں پر ڈول نہیں تھا، حضرت بی بی رابعہ بصریؒ نے اپنا جوتا اتارا، اب رسی نہیں تھی ۔ سوچا کہ کیا کروں ؟"

"ابا جی مجھے آگے آتی ہے یہ کہانی ۔ وہ اس طرح ہوا نا ۔ کہ حضرت بیؒ بی نے اپنی اوڑھنی پھاڑی اور اس کو یوں، یوں کر کے گرہیں دیں اور بس رسی تیار ۔"

جاوید نے یوں، یوں لفظ کے ساتھ انگلیوں کو گرہوں کی طرح بل

دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! تو جوتا بی بی رابعہؒ نے باندھا اور کنوئیں سے جوتے میں پانی نکال نکال کر کتیا کو پلایا"

اس پر جاوید بھی ایک کہانی سنا ڈالتا۔

"اباجی ـ وہ جو کوّا پیاسا ہوتا ہے ــ اور وہ جو خود ہی کنکر ڈالتا ہے اس گھڑے میں ــ اور پھر پانی پی کر پھر سے اُڑ جاتا ہے۔"

اور پھر تینوں تالیاں بجاتے، خوش ہوتے اور اس طرح جاوید کے دل میں انسان دوستی اور ہمدردی کی تڑپ بڑھتی گئی۔

جب وہ ذرا اور بڑا ہوا تو ماں باپ دونوں اُسے دُنیا کی تاریخ سے روشناس کراتے رہے۔ وہ کورس کی کتابوں میں بھی پڑھتا رہا اور دُکھی ہوتا رہا کہ ہر قوم کی ترقی اپنے ہی جیسے انسانوں کو زیر کرنے اور ان پر حکومت چلانے میں پوشیدہ ہے۔ جتنی ایک قوم ظالم اور جابر ہوا اتنی ہی وہ طاقتور اور مہذب کہلاتی ہے اور اسی تہذیب کے آئینے میں باپ نے اسے دکھایا کہ پاکستان کیوں؟ اور کیسے بنا؟ اور پھر بنے ہوئے پاکستان کو بگاڑنے کے لئے سن سنتالیس اڑتالیس اور پھر بھرپور انداز میں سن پینسٹھ میں ہمسایوں نے کیا سلوک کیا۔

اور پھر جاوید سن ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کی کہانیاں باپ کی زبانی سنا کرتا تھا اب اسے ان کہانیوں میں بڑا مزا آنے لگا تھا کہ ان میں اکثر کہانیوں کا ایک کردار اس کا باپ ہوتا تھا اور یہ کہ سن پینسٹھ میں وہ خود بھی موجود تھا اور اسے بہت کچھ یاد تھا۔ ڈاکٹر رضا کارانہ طور پر محاذ پر گیا تھا۔ حالانکہ اس کا فوج سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن وہ ایک مسلمان تھا اور ہر مسلمان پیدائشی سپاہی ہوا کرتا تھا اور پھر جاوید نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے گا اور عملی طور پر مجاہد کہلوانے کا حقدار بنے گا۔

اور جب سن اکہتر کی پاک بھارت جنگ نے اسے یہ موقعہ فراہم کیا تو اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ لیکن تب تک حالات نے اسے وہ معصوم اور بھولا بھالا جاوید نہیں چھوڑا تھا۔ بلکہ اب دنیا اس کے لئے

ایک چیلنج تھی۔ اس نے اس چیلنج کو قبول کر لیا تھا اور تب اس نے خود کو مشرقی پاکستان کے کسی بھی محاذ پر تعیناتی کے لئے پیش کیا تھا اور اس کی درخواست منظور ہو چکی تھی۔ اسے مشرقی پاکستان بھیجا جانا تھا۔ ممّا اور ڈاکٹر کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے نہ کوئی مزاحمت کی اور نہ ہی مخالفت بلکہ ڈاکٹر نے اُسے خوشی خوشی اجازت دی، اس کے خیال میں یہ اس کے لئے بہتر تھا کہ اس طرح وہ زیبو سے دور ہو کر اُسے بھول جائے گا اور وہ مشرقی پاکستان روانہ ہو گیا۔

جب جاوید کو مشرقی پاکستان بھیجا گیا تو اس کے ساتھ ایک میجر ڈاکٹر، دو نرسیں اور دو چار میل نرس بھی تھے۔ رات کے اندھیرے میں یہ لوگ پہنچے تھے۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ جگہ یا شہر کا پوچھتے، دن ہونے پر ان کو اتنا پتہ چل گیا تھا کہ ان کے دائیں بائیں جنگلات ہیں، پیچھے کو دلدلی علاقہ ہے اور سامنے جو میدان سا نظر آ رہا ہے اس میں دو تین ایمبولینس گاڑیاں اور جیپیں کھڑی ہیں اور فوجی سامان خیموں میں رکھا ہوا ہے۔

جنگی زخمی ہیلی کاپٹر کے ذریعے پہنچائے جاتے تھے تعینات شدہ عملہ دن رات ان کی مرہم پٹی میں مصروف تھا، جاوید کو یا کسی اور کو اتنا سوچنے سمجھنے کی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ ساتھ کام کرنے والوں کے بارے میں کچھ جان سکتے۔ توپوں، مشین گنوں اور ہوائی حملوں کی گھن گرج، ان کو یہ مہلت ہی کب دیتی تھی کہ وہ اردگرد کے علاقے یا ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔

جاوید کے ساتھ جو عملہ بھیجا گیا تھا، ان میں سسٹر کبریٰ جس کا عہدہ کیپٹن کا تھا، خود بخود ہی اس کے قریب آ گئی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے باتیں کرنے میں خوشی محسوس کرتا۔ اپنے چند روزہ قرب میں وہ ایک

دوسرے کی بہت ساری باتیں جان چکے تھے۔ وہ خود تو بڑا ایزرو رہتا کہ اس کے پاس اپنے متعلق بتانے کو تھا ہی کیا؟ وہ جھوٹ بولنا جانتا نہ تھا اور سچ نہ کہنے ہی میں اسے عافیت نظر آ رہی تھی۔ اس لئے جب بھی وہ دونوں تھوڑی دیر کو فارغ ہوتے تو باتیں کئے جاتے۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کے پاس وقت بالکل نہیں ہے اور زندگی کے اس تھوڑے عرصے میں ان کو بہت کچھ کرنا ہے۔

جاوید کبریٰ کو اپنی تعلیم کے بارے میں بتاتا، سکول کالج میں ہونے والے چھوٹے موٹے اہم، غیر اہم واقعات کی باتیں بتاتا۔ اپنے دوست احباب کا ذکر کرتا۔ اپنے ماں باپ کی باتیں بتاتا۔ لیکن اس نے عمداً عنایت اللہ خان کے خاندان کے کسی فرد کا ذکر کبھی بھی نہیں کیا اور ایسے واقعات سنانے سے گریز کرتا جن میں زیبو وغیرہ کی موجودگی کا ذرا بھی احتمال ہوتا تھا اور وہ ان سے ایسے بچ نکلتا تھا جیسے سفر کرتے ہوئے راستے کے گڑھوں سے موٹر کو بچایا جاتا ہے۔

کبریٰ بھی جاوید کو اپنا غمگسار اور دمساز سمجھنے لگی تھی۔ ان دونوں میں دوستی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ لگتا تھا دونوں میں پیار ہو گیا ہے اور جنگ کے خاتمے پر وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں گے۔

کبریٰ جاوید کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ جاوید نے کبھی بھی اس کی رام کہانی سننے کو اُسے نہیں کریدا تھا، بلکہ وہ خود ہی بولتی چلی جاتی تھی اور اپنی زندگی کی کتاب کا ایک ایک ورق آہستہ آہستہ جاوید کو پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔

وہ ایک سفید پوش خاندان کی چشم و چراغ تھی، اس کے دو بھائی شادی شدہ تھے۔ ایک بہن بیوہ تھی جس کا ایک بیٹا اور بیٹی تھی، وہ شوہر کی چھوڑی ہوئی جائیداد پر گزارہ کر رہی تھی۔ بچے چھوٹے تھے اور پڑھ رہے تھے۔ اس سے ایک بڑی بہن اور تھی اور اس سے ایک چھوٹی بہن بھی تھی۔ جو ابھی پڑھ رہی تھی۔ کبریٰ سے بڑی بہن نے میٹرک کر لیا تھا۔ اس کو سب آپا بی کہا کرتے تھے۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ سگھڑ بڑی تھی، نقش بھی خوبصورت تھے۔ لیکن جو بھی رشتہ آتا، کبریٰ ہی کے لئے ہوتا۔ مگر کبریٰ پڑھائی کا بہانہ بنا کر ہر رشتے سے انکار کرتی رہی۔ اسے باٹنی میں پی ایچ ڈی کرنا تھا کہ اُسے پودوں سے، درختوں سے، گھاس سے اور پھولوں سے پیار تھا۔ وہ اس جاندار مخلوق کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی تھی۔ اسے اکثر درخت اور پودے انسان سے بڑھ کر نظر آتے کہ وہ ہوا سے اور پانی سورج کی روشنی کی موجودگی میں نائٹروجن اور نمکیات سے خود خوراک بنانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن انسان ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کو انسان ایک طفیلی کیڑا نظر آتا ہے جو درختوں اور پودوں کی تیار کردہ خوراک پر پل رہا ہے۔ وہ اپنی اس دلیل کو کوئی منطقی جامہ پہنا کر دنیا کو بتانا چاہتی

تھی کہ غرور اور تکبر اور فخر انسان کو نہیں بلکہ گھاس پھونس، پودوں اور درختوں کو زیب دیتا ہے۔ بڑا انسان نہیں بلکہ بڑی قدرت کی یہ مخلوق ہے اور اسی لئے تو وہ باٹنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا چاہتی تھی۔

لیکن اس کو اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا تھا کہ اس کے باپ کے انتقال کے بعد دو چار دوکانوں اور ایک دو مکانات پر بھائی بہنوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ شہری جائیداد تھی منافع نقد ملتا تھا۔ سب دوکانیں اور مکانات اچھے کرایوں پر اٹھے ہوئے تھے، جس مکان میں یہ سب لوگ رہ رہے تھے۔ اس کے بٹوارے پر بھی جھگڑا اٹھ کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ مکان دو منزلہ تھا، نچلی منزل میں پانچ کمرے تھے، اس میں بڑا بھائی رہتا تھا۔ اوپر کی منزل میں صرف تین کمرے تھے۔ جس میں چھوٹے بھائی کی رہائش تھی۔ بڑا بھائی نچلی منزل میں سے ایک کمرہ بھی کسی کو دینے کا روادار نہ تھا۔ پورے مکان میں ماں بیٹیوں کو صرف ایک کمرہ دیا گیا تھا۔ ہاں وہ اوپر کی نیم چھتی بھی استعمال کر سکتی تھیں۔

شوہر کی وفات کے بعد ماں نے کبری کا رشتہ کروانا چاہا، لیکن وہ بڑی بہن کا حق چھیننا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے ماں کی سنائی ہوئی وہ کہانی یاد تھی کہ کس طرح اس کی ماں کی اور چھوٹی خالاؤں کی شادیاں ہو گئیں لیکن بڑی خالہ کنواری ہی رہ گئی تو پھر بھاوجوں نے اور بھائیوں نے اس کو اس کے بدصورت ہونے کے طعنے دینے شروع کئے جس کی بنا پر اس کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے کپڑوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر خودکشی کر لی تھی۔ اُسے ماں نے بتایا تھا کہ کتنی اذیت سے وہ موت کو گلے لگا کر سوئی تھی اور اس کے جسم کا گوشت جو آگ میں جھلس گیا اور بوٹی بوٹی ہو کر گرتا تھا اور ان کی نانی وہ لوتھڑے اٹھا اٹھا کر کپڑے میں جمع کرتی رہی تھی اور جب اس کو کفن پہنایا جانے لگا تھا تو اس کو غسل بھی ٹھیک سے نہیں

دیا جا سکتا تھا کہ صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی تھیں اور پھیروہ تو تھڑے جو دو بھرے
کپڑے میں جمع کئے گئے تھے وہ اس کے کفن میں ہڈیوں کے ساتھ رکھ کر دفنائے
گئے تھے اور اسی لئے کبریٰ نے پڑھائی کا بہانا بنایا تھا کہ وہ اپنی بڑی بہن
کا وہ حشر نہیں دیکھ سکتی تھی، جو اس کی خالہ کا ہوا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن
کے راستے کی رکاوٹ بھی نہیں بننا چاہتی تھی کہ وہ خوبصورت تھی۔ رشتے
اسی پر آتے تھے اور اس نے اپنے طور پر دونوں بہنوں کا راستہ صاف کرنے کی
خاطر نرسنگ اختیار کر لی تھی اور مشرقی پاکستان شہید ہونے آئی تھی۔

اسی طرح کا اپنی آنکھوں دیکھا ایک اور واقعہ بھی کبریٰ نے جاوید کو
سنایا تھا۔ اس کی ٹریننگ کا دوسرا سال تھا کہ ایک کیس وارڈ میں لایا گیا، وہ
ایک لڑکی تھی جس نے جسم پر پٹرول چھڑک کر خود کو آگ لگا دی تھی۔ اس کے
بڑے بڑے پالش لگے ناخن تھے، لیکن تمام ناخن تقریباً جھڑ چکے تھے صرف
انگوٹھوں اور چھپی انگلی کے ناخن رہ گئے تھے اور جب کبریٰ اس کے بے سدھ
جسم پر مرہم لگا رہی تھی تو وہ باقی کے تین ناخن بھی جھڑ کر کبریٰ کے ہاتھ میں
آگئے تھے۔ ساتھ کھڑی ہوئی دوسری نرسیں تو ڈر کر دور ہٹ گئی تھیں لیکن
وہ بالکل نہیں ڈری، اس کو اپنی وہ خالہ یاد آنے لگی تھی، جس کی کہانی
اُسے ماں نے سنائی تھی۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بھی اس کی خالہ کی
طرح کا ایک کیس ہے۔ لیکن یہ لڑکی جوان بھی تھی، حسین بھی تھی اور مالدار
باپ کی مالدار بیٹی بھی جو یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ کبریٰ کو اس سے بے انتہا
ہمدردی ہو گئی تھی۔

جس وارڈ کے سائڈ روم میں وہ لڑکی رکھی گئی تھی۔ اس میں کبریٰ کی
رات کی ڈیوٹی تھی۔ کوئی آدھی رات کا وقت ہوگا۔ اس لڑکی کو ہوش آیا۔
اس کے ساتھ کوئی بھی رشتہ دار عزیز اس وقت موجود نہ تھا۔ پچھلے تین چار
روز میں اس لڑکی کے بارے میں بہت ساری باتوں کا پتہ چل گیا تھا۔

اس کی ماں اس کو بچپن میں چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھی۔ باپ نے اسے ہوسٹل میں داخل کرادیا، پھر جب وہ یونیورسٹی پہنچی تو باپ اُسے گھر لایا اور اب کوئی وجہ معلوم ہوئے بغیر ہی وہ اس حال میں ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا آکسیجن ماسک میں پڑی تھی

جب اُسے ہوش آیا، تو اس نے پانی مانگا۔ کبریٰ نے جلدی سے بڑھ کر اُسے بڑے پیار سے پانی پلایا۔ تین چار روز میں وہ کئی بار ہوش میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھ چکی تھی۔ لیکن جب بھی کبریٰ اس پر جھکی، وہ آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

اس لڑکی کا نام نائلہ تھا۔ اس نے پانی پیا اور اپنے لئے کبریٰ کی آنکھوں میں بے پناہ ہمدردی دیکھ کر رو پڑی۔ اس کے جسم کی ساری جلد اتر چکی تھی اور وہ نہایت ہی تکلیف میں تھی۔ لیکن کبریٰ کو یوں لگا، جیسے وہ کسی اور اذیت سے دوچار ہے۔

"ماں ــ ماں ــ میری اپنی ماں۔ آؤ نا ــ یہ کیا ہو گیا؟ اپنی بیٹی کی بات تو سنو نا ــ"

اور بلک بلک کر روئی۔ کبریٰ نے اُسے تسلی دی۔

"کوئی بات نہیں ہے ابھی جو آپ کے پاس موجود ہوں، جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہیے۔ میں سنوں گی آپ کی بات۔ مجھے اپنی بہن سمجھیں۔"

"سسٹر ــ اب وقت نہیں رہا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں؟"

"جو کچھ کہنا چاہتی ہیں کہیے؟"

"نہیں ــ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں کیسے کہوں ــ کیا کہوں؟"

"آپ مطمئن رہیے ــ میں نے آپ کو بہن کہا ہے، کوئی بھی بات ہو، کہہ ڈالیے ــ میں کسی کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گی؟"

نائلہ کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ نزع کی سی کیفیت سے دوچار

ہوئی۔ کبریٰ ڈاکٹر کو بلوانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ نائلہ نے آواز دی۔

"سسٹر ٹھہریئے۔"

کبریٰ نے قریب آکر پوچھا۔

"کیا بات ہے نائلہ؟"

"آپ اکیلی ہیں نا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ اس وقت اس کمرے میں صرف آپ ہیں اور میں ہوں۔"

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے!"

"ضرور کہئے۔ کیا بات ہے؟"

"میری ماں خود نہیں گئی تھی۔ میرے باپ نے اُسے گھر سے نکالا تھا۔ میں چھوٹی سی تھی۔ میں اور کچھ نہیں جانتی۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔ اب آپ بڑی ہو گئی ہیں۔ یہ تو دنیا ہے۔ اس میں ایسا بھی ہوا کرتا ہے۔ کیوں فکر کرتی ہیں؟"

"لیکن سسٹر۔ میری طرح کسی کے ساتھ ایسا نہ ہوا ہوگا!"

"دیکھئے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے اور اگر باتیں کرنی ہی ہیں۔ تو آیئے۔ اچھی اور خوشگوار باتیں کریں۔ جب آپ تندرست ہو جائیں گی تو میں آپ کی سب باتیں پوری تفصیل سے سُن لوں گی۔"

لیکن نائلہ بضد تھی، وہ کچھ بتانا چاہتی تھی۔

"سسٹر۔ میں خود نہیں جلی ہوں! جلائی گئی ہوں!"

اس پر کبریٰ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"کس نے جلایا آپ کو؟"

"میرے باپ نے مجھے غسل خانے میں بند کر کے میرے جسم پر

بٹرول چھڑکا اور آگ لگا دی!"

"باپ نے! ـــــ لیکن کیوں؟"

"میں اپنے باپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں"

نائلہ آگے اور کچھ نہ بولی۔ اس نے بڑی بے بسی سے اپنا سر ادھر ادھر جھٹکا ۔ اور خاموش ہو گئی ۔ کبریٰ سکتے میں آگئی تھی اور تھوڑی دیر بعد جب اس پر جھکی تو وہ اذیت کے تمام مراحل طے کر چکی تھی ۔

وہ کچھ دیر تک یونہی اکیلی بے حس و حرکت کھڑی رہی ۔ اس نے اس وقت کسی کو بھی اپنی مدد کے لئے نہیں پکارا ۔ ہسپتال کی خون اور پیپ کی بھری چادر اس نے نائلہ کے جسم سے جب ہٹائی تو اس کی نظر گوشت اور ہڈیوں کے اس لوتھڑے پر پڑی جو اگر زندہ ہوتا، تو جانے نائلہ اس سے اپنا کونسا رشتہ جوڑتی بیٹے کا یا بھائی کا ـــــ

مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران جاوید نے اتنا اندازہ لگالیا تھا کہ ان کا تقرر کمانڈوز کی خدمت کے لئے ہوا ہے۔ جن جنگلوں کے درمیان اُن کا قیام تھا، ان میں گوریلا جنگ ہی لڑی جا سکتی تھی لیکن اب طاقتور ریڈار اور نئے سائنسی آلات نے اس جنگ کو بھی بے اثر بنانے کے کئی طریقے نکال لئے ہیں اور تب ہی جنگ کے دوران میدانِ جنگ میں جتنے سپاہی زخمی ہوتے ہیں گوریلا جنگ لڑنے والے بھی قریباً اسی تناسب سے کٹتے مرتے ہیں۔ یہی حال مشرقی پاکستان کے اس محاذ کا بھی تھا اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہاں اپنوں نے غیروں کا ہاتھ پکڑ کر عزیزوں کے گلے پر چھری پھروا دی۔ جب بھیدی گھر کا تھا تو لنکا کیوں نہ ڈھاتا۔ ورنہ مسلمان نے کبھی ہتھیار ڈالے ہیں۔ پھر شہادت کا مفہوم کیا ہوا؟ مجاہد کون کہلایا؟ وہ جنہوں نے اسلام کا ناموس رکھنے کے نام پر اٹھایا ہوا ہتھیار کفار کے ہاتھ میں تھما دیا اور خدا کے آگے جھکنے والا سر کفار کے آگے جھک گیا۔ یہ نظارہ جنگی قیدیوں کو ٹی وی پر دکھایا گیا تھا۔ جاوید پسپائی کا نظارہ سکرین پر آتے ہی اپنی آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ لیکن اس کے ذہن کی آنکھ کھلی تھی۔ جس سے وہ اور بھی بہت کچھ دیکھ رہا تھا۔

جاوید اکثر سوچوں میں گم ہوتا۔ وہ قید کے دن بڑے سکون سے گزار رہا تھا۔ پہلے وہ ایک بڑے قید خانے میں قید تھا بغیر کوئی جرم کئے اور اب قید خانہ چھوٹا تھا اور اس کا جرم یہ تھا کہ وہ دکھی انسانیت پر مرہم رکھنے نکلا تھا۔

جب وہ کیمپ میں تھا اور جس وقت وہ کسی زخمی کی دیکھ بھال میں مصروف ہوتا اور سسٹر کبری کی ڈیوٹی اس کے ساتھ ہوتی تو اکثر یوں ہوتا کہ کام کرتے کرتے اُسے لگتا، جیسے زیبو نرس کے لباس میں ملبوس اس کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہے اور تب اُسے زیبو بہت یاد آتی۔ سسٹر کبری کی شکل و شباہت گو کہ زیبو سے مختلف تھی لیکن اس کی چال ڈھال اور کام کرنے کا انداز بالکل زیبو جیسا تھا اور جب جنگی قیدی بن کر دیارِ غیر پہنچایا گیا تو سسٹر کبری اس سے بچھڑ گئی اور وہیں پر اُسے معلوم ہوا کہ وہ ماری گئی ہے اور زیبو جو اس کے لئے مر چکی تھی لیکن ابھی زندہ تھی۔

پہلے پہل ہر دوسرے تیسرے جاوید کی خیریت کے خطوط آتے رہے تھے۔ پھر اچانک ہی یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ حالات زیادہ نازک ہو گئے تھے۔ ہما اکثر رات کو ڈراؤنے خواب دیکھ کر چونک چونک جاتی اور پھر ہفتوں بعد ان لوگوں کو جاوید کا ایک مکتوب موصول ہوا، جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اب اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا ہے۔ خط میں کسی اور بات کی طرف اشارہ کئے بغیر یہ بھی درج تھا کہ اس کے نام لکھی ہوئی جائیداد پر اس کا اب کوئی

حق نہیں ہے اور یہ کہ وہ ڈاکٹر اور ان کی بیگم کا نہایت شکر گزار ہے، جنھوں نے اس کی پرورش اس انداز سے کی تھی کہ وہ اب کسی سہارے کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ جاوید نے لفظ پرورش کو قوسین میں نمایاں طور پر بند کیا تھا۔ خط پڑھتے پڑھتے ڈاکٹر کی نظر "پرورش" کے لفظ پر اٹک کر رہ گئی اور ہما نے کوئی تاثر دکھائے بغیر خط پڑھ کر آرام سے ڈاکٹر کو واپس کر دیا۔

اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس خط نے جاوید کے بچپن اور شعور کی عمر کے درمیان ایک حد فاصل کھینچ دی ہو۔ جس کی ایک طرف ہما کی مامتا اور جاوید کا بچپن کھڑے ہوں اور دوسری طرف جاوید اپنی تمام سوچوں اور فیصلوں کے ساتھ اکیلا ہو۔ جسے ہما نہیں دیکھ سکتی تھی۔

جاوید کے اس خط کے آنے کے بعد ہما نے بڑے ہی حوصلے سے جاوید کی تمام چیزیں اس کے کمرے میں پہنچا دیں اور ان کو تالا لگا دیا۔ جاوید کے بچپن سے لے کر آج تک کی تمام تصویروں کے بے شمار پڑے ہوئے البم اکٹھے کئے ان میں سے اس کے بچپن کی ایک ایک تصویر الگ کی اور نئے البم منگوا کر کئی دنوں کی سخت محنت کے بعد ان کو تاریخ وار سجایا، اس کی کتابیں اور کاپیاں جو ہما نے سنبھال سنبھال کر رکھی تھیں، وہ بھی یکجا کیں، اس کی نرسری کلاس سے لے کر پرائمری تک کی کتابیں کاپیاں اور بستے وغیرہ الگ کر کے اپنے پاس رکھے اور باقی چیزیں اسی کمرے میں رکھوا دیں۔ یہی کام اس نے اس کے چھوٹے بڑے جوتوں اور کپڑوں کے ساتھ بھی کیا۔

اب ہما کا زیادہ تر وقت جاوید کے بچپن کی یادگار چیزوں

اور نشانیوں کے ساتھ گزرنے لگا۔ اس نے جاوید یا اس کے ذکر اذکار سے کوئی واسطہ نہ رکھا تھا اور اگر ڈاکٹر جان بوجھ کر جاوید کا ذکر ہُما کے سامنے لے بیٹھتا تو بھی وہ بالکل انجان بنی رہتی۔ وہ کسی قسم کے جذبے کا کوئی اظہار نہ کرتی۔ اب ہُما ڈاکٹر کی نظر میں ایک ایسا اُلجھا ہوا نفسیاتی کیس بن گئی تھی جس کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔

اسی طرح کئی سال سے ہُما اپنے لئے پسند کی گئی مصروفیات میں اپنے شب و روز گزار رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اب اس کا علاج کرنا کروانا بھی چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس کو قوی اُمید تھی کہ اگر جاوید زندہ ہے تو ہُما ماحول پر آجائے گی۔

صوبہ سرحد کے میدانی علاقوں میں جس طرح بہار کا موسم اس خطہ کو جنت کا نمونہ بنا دیتا ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اور پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اس علاقے کی خزاں بھی اپنے جلو میں اداسی کی ایک ایسی لہر لئے نمودار ہوتی ہے۔ جس سے چرند، پرند تک متاثر نظر آتے ہیں اور اگر اس موسم میں کوئی سیاح اس طرف نکل آئے تو اُسے یہ تمام شمال مغربی صوبہ واقعی بے برگ وگیاہ علاقہ ہی نظر آئے اور سرحد۔ اور سرحد کی تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق لکھی گئی اکثر باتیں سچ ہی نظر آئیں گی۔

اس خطۂ زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے یعنی صوبہ سرحد کے میدانی علاقوں میں سردی، گرمی، بہار اور خزاں سبھی موسم بڑے شدید ہوا کرتے ہیں۔ جغرافیہ دانوں کا خیال ہے کہ کسی علاقے کی آب و ہوا وہاں کے باشندوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور اسی لئے یہاں کا باسی جب دشمنی کرتا ہے تو پوری شدت سے کرتا ہے اور جب پیار کرے تو بھی اس قدر شدید کرتا ہے کہ اس کے محبوب پر رشک آتا ہے۔

موسمِ خزاں میں نہ صرف درخت پودے، گھاس اپنی رعنائیوں سے محروم ہو جاتے ہیں بلکہ یہاں کے لوگوں کے شگفتہ ہنستے مسکراتے چہروں پر بھی ایک گرد سی پڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

اور پھر "جاوید ولا" تو اب کے خزاں کی زد میں اس طور آگیا تھا۔ کہ ہر سو اداسی کے سوائے نظر ہی کچھ نہ آتا تھا۔ ہما تو ایک طرح سے گوشہ نشین ہو گئی تھی، جاوید اس نشیمن کو چھوڑ چکا تھا، ڈاکٹر کی شامیں بھی اتنی بے رنگ اور بے رونق ہو گئی تھیں کہ اس سے کوئی ملنے والا آتا تھا اور نہ ہی ڈاکٹر کہیں باہر نکلتا تھا۔ لے دے کے ایک کلینک رہ گیا تھا۔ جہاں وقت پر جانا اور وقت پر واپس لوٹنا اس کے معمولات میں سے ایک ناگزیر ڈیوٹی تھی جو وہ اب تک سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے گھر پر صرف وہی ضرورت مند آنکلتے تھے جو دوسرے نئے آنے والے ڈاکٹروں کے علاج اور تجویز شدہ نسخوں میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ حالانکہ اب گزشتہ چند سال کی تاریخ جتنی یکلخت بدل گئی تھی، اسی طرح لوگوں کے ذہنوں کی سوچوں کے دھارے بھی بے یقینی کے سمندر میں بہہ نکلے تھے۔ نفسیاتی الجھنیں بڑھ گئی تھیں۔ کوئی بھی اپنے مستقبل میں یقین رکھنے کے قابل نہیں رہا تھا، ایک انتشار تھا، اقدار بدل گئی تھیں۔ روایات پلٹا کھا رہی تھی۔ جو لوگ پرانی روایات اور تہذیب کے دلدادہ تھے اُن کے لئے "پرانی نسل" کی اصطلاح نکل آتی تھی اور نئی نسل اُن کے تجربات سے اس لئے مستفید نہیں ہو سکتی تھی کہ اب نئے نئے مشاہدات کا زمانہ تھا۔ نت نئی دریافتیں ہو رہی تھیں۔ نئی نئی ایجادات عقل کو حیران کر رہی تھیں۔ سائنس کا دور دورہ تھا، دیئے کی لو کی جگہ بجلی کا قمقمہ لے چکا تھا۔ آگ جلانے کو بھی سائنس کی دریافت یعنی برقی قوت ہی ایندھن

کا کام دیتی تھی۔ سورج کی حدت مقید کی جا رہی تھی۔ کائنات تسخیر ہو رہی تھی۔ اس گھما گھمی اور دوڑ دھوپ میں بیچارے پرانے لوگ ساتھ دینے کے قابل نہیں سمجھے گئے تھے اور ان کی سوچ کو پرانی سوچ جان کر نئی نسل جان چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

لیکن ڈاکٹر مجید جیسے روشن خیال لوگوں کی اب بھی بعض لوگوں کو ضرورت تھی۔ کیونکہ نئی نسل میں وہ حقیقت پسند لوگ بھی موجود ہیں۔ جو کھنڈر دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ عمارت کبھی خوبصورت رہی ہو گی؟

اور اسی لئے ڈاکٹر مجید کے مریضوں میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی لیکن اگر کمی آئی تھی تو ڈاکٹر کی اپنی گھریلو مصروفیات میں، کہ ہما کو زندگی کی ہما ہمی سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا اور ڈاکٹر کے پاس مریضوں اور اپنی سوچوں سے، اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ جاوید ولا" کی ظاہری آن بان کی طرف بھی دھیان دیتا، تمام پودے گھاس اور درخت گزشتہ کئی برس سے بڑھ اور مر رہے تھے۔ کوٹھی کا پرانا مالی مر چکا تھا۔ نیا مالی رکھنے کا کس کو خیال آسکتا تھا۔ گھر کا پرانا ملازم کبھی کبھار اِدھر اُدھر اُگی ہوئی گھاس کاٹ لیتا تھا یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ گھر کا بھنگی جھاڑو دے کر درختوں کے گرے ہوئے پتے اٹھا لیتا تھا۔ کوٹھی کے لان میں گھاس اُگ اُگ کر، سوکھ سوکھ کر خاصی بے رونقی دکھا رہی تھی۔ جگہ جگہ جھاڑ جھنکار اُگ آئے تھے۔

اور ایسے میں ایک روز بغیر اطلاع دیئے جاوید فوجی وردی پہنے گھر میں آداخل ہوا۔ گھر کی ایسی ویرانی دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ موٹر کا ہارن سن کر ڈاکٹر اندر سے باہر آیا اور جاوید کو دیکھ کر وہ اُسے اسی طرح ملا، جس طرح ایک بچھڑے ہوئے بیٹے سے باپ ملا کرتا ہے۔ مارے

خوشی کے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پہلے تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر وہ جاوید کو ساتھ لے کر خوشی خوشی ہما کے پاس کمرے میں لے گیا اور چیختا ہوا بولا۔

"بتاؤ تو ہما ہمارے گھر کون شہزادہ آیا ہے؟"

ہما اس وقت جاوید کے بچپن کی تصویروں کے ساتھ لگی ہوئی توتلی زبان میں باتیں کر رہی تھی۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ دونوں پر ڈالی اور کسی قسم کے جذبے کا اظہار نہ کیا۔ جاوید باہیں کھولے آگے بڑھا، لیکن ہما کی آنکھوں میں اجنبیت کا رنگ دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ اس کی وا کی ہوئی باہیں یونہی رہ گئیں۔ ہما پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر آہستہ سے جاوید کی باہیں اپنے کندھوں پر ڈال دیں، اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگا اور باپ بیٹا دونوں لپٹ لپٹ کر رونے لگے۔

سن ۱۹۷۱ء کی جنگ میں جاوید جنگی قیدی بنا دیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد اس نے ڈاکٹر کو اپنے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ اور اب اتنا عرصہ گزرنے کے بعد وہ اچانک آ گیا تھا۔

ہما کی بیماری کے بعد ڈاکٹر عبدالمجید اور عنایت اللہ خان کے گھرانے اس قابل نہ رہے تھے کہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے۔ ڈاکٹر کو کافی دنوں بعد پتہ چلا تھا کہ مہر النسا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ایک آدھ گھنٹے کے لئے عنایت کے پاس پُرسا دینے چلا گیا اور پھر اس کے بعد نہیں معلوم کہ ان کا کیا حال تھا۔ ڈاکٹر نے جاوید کو شفیق اور زیبو کے المیے سے بھی آگاہ کیا جس پر جاوید چپ رہ گیا۔ لیکن ڈاکٹر نے دیکھا کہ اس کی مایوس آنکھوں میں امید کے دیے سے جھلملانے لگے ہیں۔

جاوید اپنے واپس آنے کے دوسرے ہی دن زیبو اور اس کے گھر والوں سے ملنے گل آباد کو روانہ ہوا۔ اس نے دبی زبان سے باپ کو یہ باور کرا دیا تھا کہ زیبو ڈاکٹر کی بہو بنائے جانے سے اپنی کھوئی ہوئی خوشیاں دوبارہ حاصل کر لے گی۔ یہ سن کر ڈاکٹر نے سکھ کا سانس لیا کہ اب جاوید اپنی تمام نفسیاتی اُلجھنوں کے گورکھ دھندے سے نکل کر نارمل زندگی گزار رہا تھا اور اس میں خود اعتمادی آگئی ہے۔

جب ڈیوڑھی کے آگے موٹر کا ہارن بجا تو دروازے میں بنی ہوئی چھوٹی کھڑکی سے ایک نوجوان کا سر باہر نکل آیا اور پھر وہ لڑکا دوڑتا ہوا باہر آگیا۔ جاوید کے ساتھ ہاتھ ملایا اور پوچھا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

"میرا نام جاوید ہے۔ عنایت اللہ خان چچا سے ملنے آیا ہوں۔"

"ٹھہریئے میں اطلاع کرتا ہوں۔"

اور جاوید نے چشم تصور سے دیکھا کہ اس کا نام سنتے ہی تمام حویلی میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی ہوگی۔ زیبو، افروزہ اور باقی کی خادمائیں اِدھر اُدھر دوڑتی ہوئی چارپائیوں پر گدے بچھا رہی ہوں گی۔ کرسیاں باہر نکالی جا رہی ہوں گی اور زیبو کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ہوگی، وہ سوچ رہی ہوگی کہ مجھ سے اتنا عرصہ بعد کس طرح ملے۔ لیکن جلد ہی اپنے جذبات پر قابو پا کر وہ مجھے ملنے آجائے گی۔ معلوم نہیں دور سے صرف سلام کرے گی یا آگے بڑھ کر ہاتھ ملائے گی کہ پشتون عورت کا جس مرد سے پردہ نہ ہو، اس مہمان کو مردوں کی طرح مصافحہ کر کے خوش آمدید کہتی ہے۔

انہی تصورات میں وہ گم تھا کہ ڈیوڑھی کا بڑا دروازہ کھلا اور عنایت اللہ خان عصا سنبھالے آگے بڑھے۔ جاوید فوراً موٹر سے اُتر پڑا۔ دونوں بغلگیر ہوئے۔ عنایت اللہ خان کی آواز شدتِ جذبات سے کانپ رہی تھی۔ اس کی سفید داڑھی نے جاوید کو بہت کچھ بتا دیا تھا۔ بیوی کی بے وقت موت اور اپنے بھتیجے شفیق کی کرتوتوں نے اُن کی صحت پر خاصا گہرا اثر چھوڑا تھا اور کمر میں خم سا آگیا تھا۔

عنایت اللہ خان نے جاوید سے موٹر اندر لے جانے کو کہا۔ وہ دوبارہ اسٹیرنگ پر بیٹھا اور سیدھا اس پرانی جگہ پر آگیا۔ جہاں وہ کچھ سال پہلے موٹر روکا کرتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک گھوڑا اصطبل میں سیدھا اپنے تھان پر جاتا ہے۔ جاوید کو بھی ایسا ہی لگا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر چچا عنایت کے علاوہ کوئی شناسا چہرہ اُسے نظر نہ آیا۔

چچا نے جاوید کو چارپائی پر بٹھایا اور خود بھی اس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ جب اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں ہو چکیں تو جاوید نے چچی کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اس کی نظریں متواتر اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ عنایت اللہ خان نے اپنی موٹی عینک کے پیچھے اس کی بے چینی بھانپ لی تھی۔

"بیٹا چچی اللہ میاں کو پیاری ہوئیں۔ افروزہ کی شادی ہوگئی۔ اُسے اپنے ہی دہقان اسد خان سے بیاہ دیا ہے۔ یہیں ہمارے گھر کے ساتھ والے تیسرے مکان میں رہتی ہے چند روز ہوئے اس کے ہاں خدا نے دوسرا بیٹا بھیجا ہے۔ شفیق جیل میں ہے۔ اپیلیں سب نامنظور ہو چکی ہیں۔ سزا ہو جانے کے بعد اس کے

کچھ اور جرائم سے بھی پردہ اٹھ گیا تھا۔ اب ان کی پیشیاں بھگت رہے ہیں۔ کریم خان پر فالج گرا ہے۔ گل شافیہ بیچاری اکیلی جان پر کون کون سے دکھ اٹھائے گی۔ داماد تمام زمینوں پر قبضہ کرکے ایک طرف کو ہو گئے ہیں۔ جتنا مقدمہ بازی سے بچتا تھا، اتنا ہی روز روز عدالتوں، وکیلوں اور پیشیوں کے بھنور میں پھنس گیا ہوں،،

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک جوان لڑکی دوپٹہ سر پر ڈالے چائے اور ساتھ اُبلے انڈے اور نشاستے کا حلوہ ٹرے میں لے آئی اس نے میز سیدھی کی اور برتن میز پر رکھ دیئے اور پیالیاں سیدھی کرکے چائے بنانے لگی۔

،، تابانہ بیٹی چھوڑو، چائے ہم خود بنالیں گے۔ تم جاؤ زیبو بی بی سے کہو کہ ڈاکٹر جاوید آیا ہے۔،،

جب وہ لڑکی زیبو کو بلانے فارم کی طرف چلی گئی تو عنایت اللہ خان نے بتایا۔

،، تابانہ افروزہ کی چھوٹی بہن ہے، اس کی جگہ اب یہ کام کرتی ہے ان بیچاریوں کا باپ بھی مدک، چرس، افیم کا مارا کب کا مر کھپ گیا۔ زیبو کے وہی شب و روز ہیں۔ وہی فارم اور فارم کی مصروفیات اکرے بھی تو کیا کرے؟ اکیلی ہے، اس طرح ذرا مصروفیت رہتی ہے۔ انتظار کی کٹھن گھڑیاں گزارنا اتنا سہل کام تو نہیں ہے نا بیٹے،،

اور جاوید کے دل میں ایک قندیل سی پوری آب و تاب سے جل اُٹھی۔

تابانہ واپس آئی اور شرماتی لجاتی سی ایک طرف کو آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ خاموش تھی لیکن مسکرا رہی تھی۔ جاوید کا دل زور زور

سے دھڑکنے لگا تھا اور اس نے فارم کے جانے پہچانے دروازے پر دور سے نظریں گاڑ رکھی تھیں۔

"تابانہ! زیبو آرہی ہے؟" عنایت اللہ خان نے مڑکر پوچھا۔

تابانہ بغیر جواب دیئے خاموش کھڑی رہی۔ لیکن اب بھی وہ مسکرا رہی تھی۔

"تم سے کہتا ہوں نا۔ تمہیں بھیجا تھا کہ زیبو کو بلا لاؤ اور تم یہاں کھڑی ہنس رہی ہو؟ تم نے زیبو کو بتایا نہیں کہ جاوید آیا ہے؟"

"میں نے بتایا تھا کہ خان بابا بلا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ڈاکٹر جاوید آئے ہیں؟"

"پھر وہ آرہی ہے؟"

"خان بابا! زیبو بی بی کہہ رہی ہے ۔ میں پرائی امانت ہوں۔ ایک نامحرم سے کیسے مل سکتی ہوں؟ ۔۔۔۔۔"

اور عنایت اللہ خان کا سر خود بخود جھک گیا اور جاوید نے اپنے کانوں میں ایک زوردار دھماکے کی سی آواز سنی۔ اُسے محسوس ہوا۔ جیسے یہ دھماکہ کسی نئے محاذ پر ہوا ہو؟ جس سے اُس کے جسم کے پرخچے اُڑ کر ہواؤں میں بکھر گئے ہوں۔ وہ اپنے ہی وجود کے ٹکڑوں کو سمیٹتے الٹے پاؤں موٹر کی طرف بھاگا اور ڈیوڑھی میں سے نکل کر باڑہ روڈ پر آگیا۔ اُس سے اپنی منزل پھر گم ہوگئی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے خزاں اُس کے تعاقب میں ہو! (ختم شد)

زیتون بانو
پشتو ادب کا ایک درخشندہ نام ہے۔

ادبیاتِ پاکستان میں وہ ایک ایسی منفرد ادیبہ ہے، جو اپنے افسانوں
میں اپنی روایات اور تاریخ کی عکاسی فنکارانہ انداز سے کرتی ہے۔
جنکی کہانیوں میں احساس کی
سچائی، مشاہدے کی گہرائی اور جذبات
کی گیرائی پائی جاتی ہے۔

بے باک، جرآت مندا اور ترقی پسند
نظریات کی مالک،
زیتون بانو کی گرانقدر ادبی خدمات
کا تذکرہ،
سچی اور کھری خاتون کے بارے
میں پہلی کتاب

پشتو ادب کی خاتونِ اوّل

زیتون بانو

جسے صوبہ سرحد کے نوجوان ادیب احمد پراچہ نے لکھا ہے

زیتون بانو کے افسانے کائنات پر پھیلے انسانی دکھ کی رُوداد سُناتے ہیں۔ وہ دُکھ کو محدود معنوں میں استعمال نہیں کرتیں بلکہ دُکھ ان کے نزدیک ایک گمبھیر علامت بنتا ہے اور جب یہ علامت کھلتی ہے تو اپنے دامن میں پشتون عورت کی پوری تہذیبی، ثقافتی، سماجی، نفسیاتی بے چارگی اور پشتون معاشرہ کے مخصوص جبری رسم و رواج کی ایک مکمل کہانی بنتی چلی جاتی ہے۔

جیلانی کامران

سرحد کا معاشرہ جو پچاسی اور نوے فی صد دیہی آبادی پر مشتمل ہے اور عموماً فرسودہ، کہنہ اور مجہول روایات کے طلسمات کا اسیر نظر آتا ہے اور بانو اس معاشرے کے مردوں اور عورتوں کی ذہنی تربیت و تہذیب کر رہی ہے۔ وہ جس سمت کی آگہی اور معرفت رکھتی ہے اسی سمت اس معاشرے کو لے جانا چاہتی ہے کہ اُدھر روشنی ہے اور صحت مند زندگی کی قدروں کا احساس ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل

"ڈھول" واقعات کا نہیں، واردات کا ناول ہے، اس میں کہانی تو ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حقیقی زندگی کی تصویریں بھی ہیں۔ ان تصویروں میں فوٹو جیسی ہُوبہُو نقالی نہیں ہے بلکہ ایسا ہے کہ ان پر حقیقت کا گمان گزرتا ہے اور اس گمان کے کہیں بہت نیچے یقین ایک روشن تارے کی طرح نہیں، بلکہ ایک ٹیس کی طرح دل کو کاٹتا ہُوا گزر جاتا ہے۔

احمد سلیم